وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں

علمائے دیوبند کی واضح تحریرات

حسبِ ارشاد

جناب مولانا صفی اللہ صاحب مدظلہ العالی مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

اور

مسیح الامت شیخ المشائخ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب امت برکاتہم

مرتب

شعبہ نشر و اشاعت مدرسہ مفتاح العلوم

قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر پن ۲۳۷۷۰۲

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں

علمائے دیوبند کی واضح تحریرات

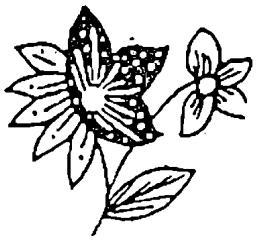

حسبِ ارشاد

جناب مولانا صفی اللہ خانصاحب مدظلہ العالی مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

ابن

مسیح الامت شیخ المشائخ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب دامت برکاتہم

منجانب

شعبہ نشر واشاعت مدرسہ مفتاح العلوم

قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر پن ۲۴۷۷۷۲

نام کتاب ——— شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں
(علماء دیوبند کی واضح تحریرات)

منجانب ——— شعبہ نشرواشاعت مفتاح العلوم جلال آباد
ضلع مظفر نگر (یو، پی)

تعداد طباعت ——— ایک ہزار

مطبع ——— شیروانی آفسیٹ پریس دہلی

قیمت ———

ملنے کے پتے

مکتبہ فیضِ اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر
ادارۂ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون مظفر نگر
عظیم بکڈپو جامع مسجد دیوبند سہارنپور
کتب خانہ عزیزیہ دہلی

شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں

علمائے دیوبند کی واضح تحریرات۔

اس مجموعے میں

---

(۱) قطب الارشاد حضرت گنگوہی ؒ (۲) حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی ؒ (۳) حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (۴) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ (۵) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (۶) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند (۷) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (۸) حضرت مولانا محمد طاہر صاحب ؒ نبیرہ حجۃ الاسلام نانوتوی ؒ (۹) فقیہہ العصر حضرت علامہ ظفر احمد صاحب ؒ عثمانی (۱۰) مصلح الامت شیخ طریقت حضرت مولانا محمد وصی اللہ صاحب ؒ خلیفہ اجل حضرت تھانوی ؒ (۱۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب ؒ (۱۲) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب ؒ مفتی اعظم پاکستان (۱۳) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ؒ امیر جماعت تبلیغ (۱۴) حضرت مولانا بدر عالم صاحب ؒ مہاجر مدنی (۱۵) سحبان الہند حضرت مولانا محمد سعید صاحب ؒ دہلوی (۱۶) حضرت مولانا محمد میاں صاحب ؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند (۱۷) جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند (۱۸) جناب مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کی تحریرات شامل ہیں۔

آخر میں اکابر جمعیۃ علماء ہند کی ایک متفقہ دستاویز بھی شامل کر دی گئی ہے۔ جسمیں تصریح ہے کہ فیصلہ کثرت رائے پر نہ ہوگا بلکہ صدر کی صوابدید پر ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک ضروری وضاحت

رسالہ اہتمام و شوریٰ کی اشاعت کے بعد جمہوریت کے حامی حضرات کیجانب سے متعدد مضامین رسالہ کے رد میں شائع کئے گئے بعض حضرات نے مستقل کتاب بھی اس کے جواب میں لکھی۔

اہلِ حق کا طریق چونکہ ہمیشہ صرف اظہار حق رہا ہے اور قیل وقال سے اجتناب فرمایا ہے اس لئے حضرت والا دامت برکاتہم نے رسالے کے رد میں شائع کئے گئے مضامین کا جواب شائع نہیں کرایا اور متعدد مجلسوں میں یہ ارشاد فرمایا کہ رسالہ اہتمام و شوریٰ میں یہ مسئلہ دلائل کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ امیر کی رائے پر ہے اہلِ شوریٰ کی کثرتِ رائے پر نہیں ہے۔

اس کے خلاف بعض حضرات نے جو کچھ لکھا ہے، ان کی بھی تحریرات موجود ہیں اب جس کے نزدیک جو صحیح ہو اس پر عمل کرلے قیل وقال میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ بعض خدام نے عرض کیا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ :-

اگر پہلے جواب میں کوئی حقیقت مخفی رہ گئی تھی جس سے وہ اعتراض پیدا ہوا تو اس حقیقت کو پھر شائع کر دیا جائے اور اگر حقیقت ہی کی تکذیب کی گئی ہو تو پھر جواب نہ دیں کہ اس سلسلۂ لاتقف عند حدٍ میں بجز اضاعتِ وقت کے کوئی فائدہ نہیں۔ (بیاض اشرفی ص۸۹)

اور اس مسئلہ کے بارے میں ہمارے اکابر کے مسلک کو بالکل مخفی کر دیا گیا ہے، اور اپنے تمام اکابر خصوصاً حضرت تھانوی رح کے مسلک کو ان حضرات نے بالکل ہی بدل کر پیش کیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اصل حقیقت کا اظہار کر دیا جائے۔ یہ عرض کرنے پر حضرت والا دامت برکاتہم نے اکابر رح کے مسلک کے بارے میں وضاحت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اکابر کی تحریرات کے اس مجموعے کی اشاعت کا مقصد محض اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہمارے اکابر مروجہ جمہوریت کے شورائی نظام کے قائل نہیں تھے۔ انشاء اللہ العزیز ان تحریرات کو پڑھ کر کوئی بھی خالی الذہن صاحبِ علم اس حقیقت کا پوری طرح اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے اکابر مروجہ جمہوریت کے قائل نہیں تھے۔

فہرست مضامین شوریٰ ہیئتِ حاکمہ نہیں

عنوان	صفحہ
پیش لفظ	۱
مولانا گنگوہی رح	۱۰
نقل تحریر حضرت گنگوہی رح	۱۱
درخواست اہل مشورہ	۱۳
اہم انتباہ	۱۵
حضرت نانوتوی	۱۶
ایک ضروری توضیح	۱۷
شاہ رفیع الدین صاحب کے اصولِ ہشتگانہ	۱۹
حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا تھانوی رح	۲۲
شخصیت ہی معقول اور منقول ہے۔	۲۳
جمہوریت مروجہ	۲۶
نہ معقول ہے نہ منقول	۲۶
کثرت رائے پر مدار کی حقیقت	۳۰
مکالمہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی	۳۱
مع سرسید احمد خاں	۳۱
جمہوری سلطنت پر استدلال	۳۴
اور اس کا ابطال	۳۴
قرآن پاک کا طرز جواب	۳۸
کثرت رائے کے غلط ہونیکی دلیل	۴۴
کثرت رائے کے غلط ہونیکی	۴۶
نہایت قوی اور واضح زلیل	۴۶
مہتمم کا منصب	۴۸
شوریٰ کا منصب	۴۹
آج کی شوریٰ اکابر کے طریق پر نہیں	۵۱
مضمون استفسار	۵۴
ایک اشکال کا جواب	۵۶
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب	۶۰

عنوان	صفحہ
مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۶۱
اسلامی خلافت ملوکیت ہے	
یا جمہوریت ؟	۶۱
ملوکیت اور شخصیت کے مفاسد	۶۲
جمہوریت کے مفاسد	۶۳
اسلام کا معتدل نظام	۶۵
ایک شبہ کا ازالہ	۷۰
مشورہ کا فیصلہ کثرتِ رائے پر ہے	
یا امیرِ مجلس کی رائے پر ؟	۷۶
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے	
مشاورات اور فیصلہ کی صورت	۷۸
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۸۳
ایک اور واقعہ	۸۴
تیسرا واقعہ	۸۵
خلفاء راشدین کی مجلسِ شوریٰ	۸۷
حضرت صدیق اکبرؓ کی مجلس شوریٰ	۸۸
حضرت فاروق اعظمؓ کی انتظامی	
خصوصیت	۹۳

عنوان	صفحہ
کثرتِ رائے کی حقیقت اور	
اس کا فائدہ	۹۷
آزادی اور غلامی کا بے معنی راگ	۱۰۰
خلافتِ اسلامیہ نہ موجودہ جمہوریت	
کا نام ہے نہ شخصیت کا۔	۱۰۲
حکیم الاسلام قاری	
محمد طیب صاحب	۱۰۴
کثرتِ رائے اور قوتِ رائے	۱۰۵
کثرتِ رائے کی بے وزنی	۱۰۵
کثرتِ رائے کہاں اور کس شرط	
سے معتبر ہے۔	۱۰۷
مولانا محمد طاہر صاحبؒ	۱۱۱
مرکزیت و جمہوریت پر عقلاً، عرفاً	
شرعاً نقد و تبصرہ	۱۱۲
امیر و سرپرست کی شرعی عقلی عرفی	
حیثیت پر ایک مشترکہ تقریر	۱۱۶
جو نظم و مذہب وحدت کے مراتب	

عنوان	صفحہ
طے نہ کرائے وہ نظم و مذہب حق نہیں ہو سکتا۔	۱۱۷
حکم کا مرتبہ شخص واحد کیلئے ہے۔	۱۱۹
وحدتِ نظم و وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل	۱۲۴
کثرتِ رائے کا اصول قرآن مجید میں نہیں	۱۲۵
بحالتِ غلبہ و مغلوبیت اسلام کی تعلیم	
دربارہ قیام امارت	۱۲۶
نظامِ کثرت و قلت میں ترجیح خداوندی	۱۲۸
اطاعتِ امر اور اطاعتِ خدا اور رسول کے مراتب	۱۲۸
چند نظائر شرعیہ	۱۳۰
قضاء قاضی	۱۳۰
امارتِ سفر	۱۳۱
امارتِ امامت صلوۃ	۱۳۱
واقعہ جنگ بدر اور آنحضرتؐ کا فیصلہ	۱۳۱
فیصلہ شرعی کا مدار کثرت پر نہیں	۱۳۲
غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ	

عنوان	صفحہ
علیہ وسلم کا فیصلہ	۱۳۳
خلافتِ راشدہ کے چند نظائر	۱۳۴
روانگیٔ شام اور حضرت فاروق اعظم کا آخری حکم	۱۳۵
موجودہ جمہوریت اور اسلامیت کا فرق	۱۳۷
امیر مشورہ نہ لے تو یہ ملوکیت ہے	۱۳۷
امیر کو با اختیار نہ رکھا جائے	
یہ آجکل کی جمہوریت ہے	۱۳۸
مدعیان جمہوریت بھی وحدت پرست ہوتے ہیں	۱۳۹
نظام فرنگ کی بنا کیا کثرت پر ہے	۱۴۰
وحدتِ غالبہ کا ثبوت انسانی ساخت سے	۱۴۱
امارت عامہ کا غامض اصول	
اور اسپر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد	۱۴۱
تعامل و نظائر بزرگان سلف دارالعلوم دیوبند	۱۴۲
(دور اول دارالعلوم)	۱۴۴

عنوان	صفحہ
امور جزئیہ میں مرکزیت	۱۴۴
امور کلیہ میں مرکزیت	۱۴۷
آخر رائے اہلِ شوریٰ	۱۵۰
نتائج	۱۵۱
دور ثانی	۱۵۳
دور ثالث	۱۵۶
تبصرہ بر کارروائی بالا	۱۵۷
دور رابع	۱۵۸
واقعات بطور نظائر بزمانہ حضرت گنگوہیؒ	۱۵۹
حضرت سرپرست کی رائے اور حکم کا فرق	۱۶۱
دور خامس	۱۶۵
دور سادس	۱۶۶
دور سابع	۱۶۸
تجویز سرپرست	۱۶۹
خلاصہ	۱۷۳
مولانا ظفر احمد عثمانی	۱۷۵

عنوان	صفحہ
مولانا وصی اللہ صاحب	۱۸۱
شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب	۱۸۲
مفتی جمیل احمد صاحب	۱۸۵
مولانا محمد یوسف صاحب	۱۸۸
مولانا بدر عالم صاحب	۱۹۰
مولانا محمد میاں صاحب	۱۹۱
سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب	۱۹۲
مفتی محمود حسن صاحب	۱۹۴
مولانا محمد تقی صاحب عثمانی	۱۹۷
شخصی حکومت	۲۰۶
اکابر جمعیۃ علماء ہند کی متفقہ دستاویز	۲۱۲
خلاصۂ کلام	۲۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد۔ دو سال قبل یہاں سے ایک رسالہ "اہتمام و شوریٰ" کے نام سے شائع کیا تھا اس میں دلائل نقلیہ وعقلیہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مجلس شوریٰ اصل ذمہ دار اور امیر کار کیلئے معین و مددگار ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ذمہ دار کے سامنے واقعۂ مبحوثہ کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں پھر ذمہ دار کے لئے ادارہ کے مناسب رائے کو اختیار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اس کے برخلاف بعض حضرات نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے اکابر شوریٰ کو حاکم قرار دیتے تھے، اور اسی جمہوری نظام کو قائم کئے ہوئے تھے، حالانکہ اکابر دارالعلوم کی تحریریں اور بیان اس سے آبی ہیں۔

ہمارے اکابرین نے ہمیشہ اس جمہوری نظام کا رد فرمایا ہے، جس میں شوریٰ کو امیر پر بالادستی حاصل رہتی ہے۔

جیسا کہ اس مجموعہ میں شامل ان کی واضح تحریرات سے مدلل طور پر ثابت ہے اور ان کا عمل بھی ہمیشہ جمہوری طرز کے خلاف رہا ہے

جیساکہ رسالہ "الوحدۃ فی الاسلام" میں اکابر کے دور کے معمول بہا طریق کو مختلف قسم کے دلائل وشواہد کے ساتھ مبرہن طور پر بیان فرمایا گیا ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہے۔ اہل علم حضرات ان تمام تحریرات کو پڑھ کر یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ رسالہ اہتمام وشوریٰ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سب کچھ من وعن وہی ہے جو کچھ ان اکابر نے تحریر فرمایا ہے، اب اس مجموعہ میں شامل تحریرات کا مختصر سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اس مجموعے میں سب سے پہلے قطب العالم امام ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تحریر پیش کی جارہی ہے جن کی ذات گرامی پوری جماعت دیوبند میں منتہی الاسناد کا درجہ رکھتی ہے کہ ان کے بعد کسی دوسری سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ تحریر حضرت گنگوہی رح نے ۱۳۱۴ھ میں اس وقت لکھی ہے جب آپ کی خدمت میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی سرپرستی کی درخواست پیش کی گئی۔

اس میں حضرت گنگوہی رح تحریر فرماتے ہیں:۔

رشید احمد کی سرپرستی مدرسہ اس طرح ہم قبول کرتے ہیں کہ جو تغیر وتبدل وعزل ونصب ملازمین واہل شوریٰ کرے ہم کو منظور ہوگا کسی بارہ میں ان کا خلاف نہ ہوگا تو میں سرپرستی منظور کروں گا جیسا کہ اہل مدرسہ دیوبند نے کر رکھا ہے۔

اہل علم انصاف سے فرمائیں کہ کیا شوریٰ کی بالادستی کے اصول کے تحت اس کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ کسی بھی فرد واحد کی رائے کو ناطق و

مختتم قرار دیا جائے۔ اور اگر شوریٰ کی بالادستی ہی اصول شرعی ہوتا تو کیا حضرت گنگوہی رح اپنے لئے اس کے خلاف تجویز فرما سکتے تھے؟ ہرگز نہیں، جبکہ حضرت رح نے اپنے لئے اتنے وسیع اختیارات تجویز فرمائے ہیں کہ خود ارکانِ شوریٰ میں سے بھی آپ جسے چاہیں علیحدہ فرما سکتے ہیں اور جسے چاہیں مقرر فرما سکتے ہیں یہ تو صراحتاً شوریٰ پر فرد واحد کی مکمل بالادستی کا بین ثبوت ہے۔

(۲) دوسری تحریر حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رح کی ہے، حضرت نانوتوی رح اصول ہشتگانہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔

شوریٰ کی بالادستی کے جمہوری نظام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ مجلس شوریٰ کے علاوہ کسی بھی وارد وصادر ذی علم صاحب عقل سے مشورہ کو کافی سمجھ لیا جاتا ہو۔

(۳) تیسری تحریر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ہے جس پر اس زمانے کے تمام اکابر کے دستخط ہیں تحریر فرماتے ہیں "ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بنا ایک شخص کی رائے پر مبنی رہنی چاہیئے اس قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی کو اہل مشورہ میں دخل نہ ہو الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرما دیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کریں مقبول ہوگا۔"

کیا شوریٰ کی بالادستی کے نظام میں مدرسے کے تمام داخلی نظام میں مہتمم

اس طرح مختار کل ہو سکتا ہے کہ اس کے نظام میں کسی بھی اہلِ مشورہ کو دخل نہ ہو۔

(۴) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس بارے میں روز روشن کی طرح عیاں ہے، چنانچہ اپنی تفسیر بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرائے والمشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے۔"

اس کے باوجود حضرت تھانوی رح کے مسلک کی غلط تعبیر و توجیہ کی گئی ہے، اور آپ کے اصل مسلک پر پردہ ڈال کر وہ دوسرا مسلک جسکی آپ ہمیشہ تردید فرماتے رہے آپ کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رح کے مسلکِ حق کو آپ کی متعدد تحریرات سے واضح طور پر واشگاف کر دیا گیا ہے۔

(۵) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:۔

سرپرست صاحب دارالعلوم دیوبند کو ایسے اختیارات دینا کہ انکی رائے خواہ قلت کی جانب ہو خواہ کثرت کی فیصلہ اسی پر ہوگا بظاہر مستبعد معلوم ہوتا ہے لیکن وجہ استبعاد کچھ نہیں معلوم ہوتی، اسلام کی حکومت و شوریٰ کا طرز قرنِ اوّل میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ بعد استشارۂ اہل الرائے خلیفہ عمل میں مختار ہوتے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اس واضح بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر کے زمانہ خیر و برکت میں

فیصلہ کا مدار شوریٰ کی کثرت رائے پر نہیں بلکہ فرد واحد یعنی سرپرست صاحب کی رائے پر ہوتا تھا اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا معمول رہا ہے اس واضح تحریر سے اکابرؒ کے دور میں شوریٰ کے ہیئت حاکمہ ہونیکا دعویٰ بالکل رد ہوگیا اور رسالہ الوحدۃ فی الاسلام میں حضرت مولانا طاہر صاحبؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسکی حرف بحرف تصدیق اور تائید ہوگئی۔

(۶) حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کس پایہ کے محقق عالم ہیں اس کا اندازہ اعلاء السنن سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے حضرت حکیم الامتؒ کی زیر نگرانی لکھی ہے۔ حضرت مولانا نے احکام القرآن میں آیۃ کریمہ وشاورہم فی الامر کی تفسیر میں اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ مدلل طور پر تحریر فرمایا ہے احکام القرآن سے وہ حوالے نقل کردئے گئے ہیں۔

(۷) رسالہ الوحدۃ فی الاسلام مصنفہ حضرت مولانا محمد طاہر صاحب نبیرۂ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز ہے جس میں مرکزیت وجمہوریت پر عقلاً عرفاً شرعاً نقد وتبصرہ کیا گیا ہے اور چند نظائر شرعیہ اور مقدس اکابر و بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے طریق کار اور ان کے طرز عمل سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کی امارت عامہ وخاصہ دونوں میں وحدت ومرکزیت ہی اصل ہے۔ شوریٰ کی بالاتری یورپ کی خود ساختہ جمہوریت کی پیداوار ہے۔

(۸) مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، عہدِ حاضر کے بہت بڑے محقق عالم اور فقیہ العصر ہوئے ہیں، آپ کی تصنیفات و

تالیفات اپنی پوری جماعت میں سند کا درجہ رکھتی ہیں آپ نے تعلیماتِ اسلام کے نام سے اس موضوع پر مفصل و مدلل کتاب تحریر فرمائی ہے یہ کتاب بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

(۹) حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رح نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اپنی کتاب فطری حکومت میں اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، کتاب کا وہ حصہ بھی اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

(۱۰) شیخ طریقت مصلح الامت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب الہ آبادی نوراللہ مرقدہٗ کا ایک مضمون ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:۔

"چونکہ کسی معاملہ کے تمام پہلو ایک شخص کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے تمام گوشوں کو سامنے لانے کے لئے مشورہ کیا جاتا ہے باقی امیر کو اختیار ہے کہ ان آراء میں سے جس کو احسن سمجھے اس کا انتخاب کرے (مشورہ) اس لئے (ہے) کہ مشورہ کے ذریعہ اس انتخاب کا موقع مل جاتا ہے۔

(۱۱) شیخ طریقت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ نے "اوجز المسالک" میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشاورت کا ایک ذکر فرمانے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔

فنادٰی عمر حسین استقر رایہ علی رای المشیخۃ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ اہل مشورہ کی رائے پر نہیں بلکہ امیر کی رائے قرار پانے پر ہے۔

نیز اگر حضرت عمر رضؓ اہل مشورہ کی رائے کے پابند ہوتے تو آپ کو تین

مرتبہ مجلس شوریٰ کو بدلنے کا اختیار نہ ہوتا پہلی مرتبہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہو جاتا۔ پورا واقعہ اس رسالہ میں مذکور ہے۔

(۱۲) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی اعظم جامعہ اشرفیہ لاہور کا مضمون شامل ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

اسلام اسی فطری قانون سے کام لیتا ہے کہ اہل لوگوں سے مشورہ لے کر حاکم اللہ کے بھروسہ پر فیصلہ دیتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں آپ نے مروجہ جمہوریت کے نقائص کو بیان فرماتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ جہاں جمہوریت کا نام ہے کام وہاں بھی شخصیت ہی سے چلتا ہے۔

(۱۳) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ امیر جماعت تبلیغ نے اپنے قلم سے تبلیغی کام کرنے والے حضرات کے لئے مشورہ کا طریق تحریر فرمایا ہے۔ موصوف رح کے مکتوب گرامی کا وہ حصہ ان کی سوانح سے نقل کیا جا رہا ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "ہمارے یہاں فیصلہ کی بنیاد کثرت رائے پر نہیں"

(۱۴) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی اور (۱۵) مولانا محمد میاں صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی تحریرات بھی شامل ہیں۔ ان دونوں حضرات کی تحریرات کا ماحصل بھی وہی ہے جو اور اکابر حضرات کی تحریرات کا ہے۔

(۱۶) سحبان الہند حضرت مولانا سعید احمد صاحب دہلوی جو ہمیشہ جمعیۃ علمائے ہند کے رکن رکین رہے وہ اپنی تفسیر کشف الرحمٰن میں

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں :۔

"اہم معاملات میں اگرچہ رائے کی تعمیم نہیں ہے لیکن اہل الرائے سے رائے لیا جانا ضروری ہے" پھر آخری فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے "تاکہ جماعتی نظم قائم رہے"

مولانا سبحان الہند رح ایک زمانہ تک جمعیۃ العلماء کے صدر اور دارالعلوم کی شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔ آپ اپنی تفسیر میں واضح الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں

"پھر آخری فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے تاکہ جماعتی نظم قائم رہے ناظرین خود غور فرما کر فیصلہ فرمالیں۔

(۱۷) حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی دامت برکاتہم صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا ایک مفصل فتوی ان کے فتاویٰ محمودیہ جلد اوّل سے نقل کیا گیا ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ فیصلہ کن رائے صدر کی ہوگی۔

(۱۸) اٹھارواں مضمون مولانا محمد تقی صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم کراچی اور جسٹس سپریم کورٹ پاکستان خلف الرشید حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رح کا ہے۔ مولانا موصوف کا رسالہ الحسن میں "حکیم الامت کے سیاسی افکار" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے "شرعی سیاسی افکار" اپنے دلکش علمی انداز میں بیان فرمائے ہیں اور یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ غیر مسلم مشہور سیاستداں بھی صحیح تجربات کے بعد وہی کہنے پر مجبور ہوئے ہیں جو حکیم الامت رح کی "نظر بصیرت" نے پہلے ہی فرما دیئے تھے۔ جدید ذہن کے حضرات کی مذہبی ضیافت کے لئے اس کا ایک اقتباس بھی رسالہ ہٰذا میں درج کر دیا گیا ہے۔

ہر انصاف پسند صاحب علم ان تمام تحریرات کو پڑھ کر انشاء اللہ العزیز یہی فیصلہ کرے گا کہ رسالہ اہتمام و شوریٰ میں جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں حضرات اکابر دیوبند حضرت گنگوہی حضرت نانوتوی اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا مسلک ہے۔ اس کے خلاف کوئی نئی چیز نہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(ادارہ)

قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ
کی واضح تحریر

سب سے پہلے قطب الارشاد حضرت گنگوہی رح کی ایک نہایت واضح تحریر پیش کیجاتی ہے

جو اس باب میں نہایت مستند اور برہان قاطع اور آخری وحتمی فیصلہ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ حضرت کی وہ تحریر ہے جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ کو اس وقت تحریر فرمائی تھی جب مظاہر علوم سہارن پور کی سرپرستی کے قبول کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں درخواست پیش کی گئی تھی۔ اس تحریر کے جواب میں تمام اہلِ شوریٰ نے باتفاق رائے اس بات کو قبول کیا کہ فیصلہ آپ کی رائے پر ہوا کرے گا اور جو بھی آپ فرمائیں گے وہ ناطق ومختتم رہے گا۔ اور چوں کہ اصل مرکزی بحث یہ ہے کہ جمہوریت یعنی کثرت رائے پر انتظام چلے یا بہت سے افراد کے بجائے ذمہ دار اور امیر کا رصرف ایک ہی رہے اور مشورہ کے بعد اسی کی رائے اور صوابدید پر انتظام کا معاملہ رکھا جائے۔ کونسا طریق شریعت نے تعلیم فرمایا ہے۔ اس تحریر سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ نفاذ امر کا اصل مرجع شوریٰ نہیں ہے۔ شوریٰ کا کام تو صرف رائے دیکر خالی الذہن ہوجانا ہے۔ نفاذ امر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نفاذ کا تعلق صرف فرد واحد اور شخصیت منفردہ سے ہے۔ اب خواہ اس کو سرپرست

کا نام دیا جائے خواہ مہتمم کا خواہ ناظم کا۔ اس تحریر میں نفاذ امر کا تمام تر اختیار حضرت گنگوہی رح نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جو کہ جمہوریت مروجہ کے بالکل خلاف ہے اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ خلاف شرع امر کو حضرت رح نے اپنے لئے تجویز فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا الغرض اس تحریر سے بالکل واضح ہے کہ شوریٰ کو انتظامی امور میں بالادستی حاصل نہیں ہے اس ضروری تمہید کے بعد حضرت گنگوہی کی تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

نقل تحریر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

نحمدہٗ ونصلی از بندہ رشید احمد عفی عنہ ـــــ بگرامی خدمت اہلِ مشورہ مدرسہ عربی سہارن پور بعد سلام مسنون!

آنکہ تحریر آپ صاحبوں کی در باب سرپرستی مدرسہ سہارنپور موصول ہوئی میرا حال آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ میری سرپرستی مدرسہ میں اسی قدر ہو سکتی ہے کہ جو کچھ آپ صاحبوں نے دریافت کیا اس کو قبول کر لیا یا قبول نہ کیا اور یہ زمانہ ایسا خودرائی اور نزاع کا ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کی بات ماننا دشوار ہے، دوسرے کی رائے کا تابع ہونا ناپسند ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی وقت بندہ کی رائے کے بارہ میں بھی یہی امر پیش آیا کہ بندہ کی رائے موافق ہوئی تو قبول کی ورنہ رد کر دی تو ایسی سرپرستی سے کیا نفع، بلکہ آپ صاحبوں میں زیادتی نزاع کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے پیشتر بھی سہارن پور میں زبانی کہدیا تھا کہ اگر تمام اہلِ مشورہ

تحریری طور پر قبول کریں کہ رشید احمد کی سرپرستیٔ مدرسہ اس طرح ہم قبول کرتے ہیں کہ جو تغیر و تبدل و عزل و نصب ملازمین و اہل شوریٰ وہ کرے ہم کو منظور ہوگا کسی بارہ میں ان کا خلاف نہ ہوگا تو میں سرپرستی منظور کروں گا۔ اب آپ کی یہ تحریر پہونچی تمام اہلِ مشورہ کے اس پر دستخط بھی نہیں ہیں، سو خیر اگر آپ صاحبان اس مضمون کو قبول فرماویں کہ مدرسہ میں جو کچھ میں رائے دوں گا آپ اس کو پختہ ہو کر عملدرآمد کریں گے اور کسی کی مخالفت اور ہٹ کی پروا نہ کریں گے خواہ کوئی مدرسہ میں داخل رہے یا جُدا ہو جائے، جیسا کہ اہلِ مدرسہ دیوبند نے کر رکھا ہے تو میں آپ کے مدرسہ کی سرپرستی قبول کروں گا۔ دیوبند کا حال آپ کو معلوم ہے کہ وہاں نزاع پیش آیا اور کیسے بڑے کا نزاع پیش آیا اور کیسے بڑے ذی وجاہت کا خلاف ہوا پر اہلِ مشورہ نے میری رائے کو اپنی اور سب کی رایوں پر مقدم رکھا خواہ ان کی فہم میں میری رائے آئی یا نہیں آئی انھوں نے اس کو قبول کیا اڑے رہے اس کے خلاف ہرگز نہ کیا۔

سو اگر آپ صاحب بھی اسی طرح قبول و منظور فرماویں تو مجھ کو بھی سرپرستی آپ کے مدرسہ کی قبول ہوگی ورنہ برائے نام سرپرستی سے کوئی نفع نہیں ہے۔

فقط والسلام

اس تحریر کے جواب کا منتظر ہوں جب آپ اس کا جواب تحریر فرما کر بھیجیں گے میں اسی پرچہ کی پُشت پر اپنی قبولیت لکھ کر اور دستخط کر کے واپس کر دوں گا اور وہ تحریر دفتر مدرسہ کے کاغذات میں محفوظ

رہے گی۔

فقط رقیمہ رشید احمد عفی عنہ از گنگوہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ

یوم شنبہ

تاریخ معین ہو کر خط "اہلِ مشورہ" کے سامنے پیش ہوا

۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ خلیل احمد عفی عنہ

مشورہ کے بعد اہل شوریٰ نے باتفاق رائے حضرت مولانا گنگوہی رح کی خدمت میں یہ درخواست بھیجی۔

درخواست اہلِ مشورہ

جناب مولانا صاحب مخدوم و مطاعِ نیازمنداں حضرت مولانا رشید احمد صاحب دام مجدکم بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ گذارشِ خدمت فیضدرجت یہ ہے کہ حضور والا کا والا نامہ مؤرخہ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ جملہ اہلِ مشورہ کے سامنے پڑھا و سُنا گیا اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب سے بار سال خط جو رائے طلب کی گئی ہے وہ بھی دیکھی گئی چنانچہ سب اہل شوریٰ کی رائے ہے اور درخواست ہے کہ مولانا صاحب مخدوم سرپرست مدرسہ قبول و منظور کئے جاویں۔ اور سب کو احکام و رائے مولانا صاحب بدل و جان قبول و منظور ہوں گے۔ کسیکو عذر و تامل نہ ہوگا۔ حضور والا سرپرستی اس مدرسہ سہارن پور کی قبول فرماویں اور دعا فرماویں کہ کوئی مناقشہ و جھگڑا اہلِ مشورہ و اہلِ شہر میں نہو اور سب لوگ شہر کے باتفاق خیر خواہ و ہمدرد و معاون مدرسہ کے رہیں اور سب اہل مدرسہ کی دست بستہ

عرض ہے کہ ہم معاملات متعلقہ مدرسہ میں وقتاً فوقتاً حسب آمدورشد مشورہ کرتے رہیں گے۔ اگر اختلافِ رائے ہو تو مولانا صاحب یعنی حضور کی خدمتِ والا میں اطلاع دی جایا کریگی بحالت اختلاف رائے کے حضور جو فیصلہ فرمادیں گے وہ ناطق و مختتم ہوگا تاکہ کاروبار روزمرہ میں حرج واقع نہ ہوئے اور ہر ایک جلسہ کی روئداد حضور کے ملاحظہ کے واسطے بغرض اطلاع پہونچ جایا کرے گی اور خط مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کی نقل رکھ کر جناب کی خدمت میں بھیجا جاتا ہے جس میں اُنھوں نے اپنی رائے لکھی ہے۔ عریضہ ہذا میں سب حاضرین جلسہ نے دستخط کردیئے

فقط ازحد ادب المرقوم یکم ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ

(اصل تحریر میں تمام اہلِ شوریٰ کے دستخط ہیں)

اس تحریر کے پہونچنے پر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حسبِ ذیل جواب تحریر فرمایا۔

بندہ رشید احمد کی طرف سے بعد سلام مسنون الاسلام کے مطالعہ فرمائیں کہ سرپرستی آپ کے اس مدرسہ کی بندہ کو بدیں شرائط مذکورہ منظور ہے۔

فقط والسلام۔ بندہ رشید احمد عفی عنہ

مؤرخہ نہم ربیع الثانی روز جمعہ ۱۳۱۴ھ

اس تمام تحریر سے بخوبی واضح ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رح جو سب کے مُسلم بزرگ ہیں انھوں نے شوریٰ کو بالادستی نہیں دی بلکہ آخری فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھا جس سے شوری کی بالادستی ختم ہورہی ہے۔

اہم انتباہ

نیز حضرت گنگوہی رح کی تحریر مذکور سے جہاں مظاہر علوم کے معاملہ میں حضرت گنگوہی کا استبداد و استقلال ظاہر ہوتا ہے وہیں مدرسہ دیوبند کی سرپرستی میں بھی مستقل بالرائے ہونا معلوم ہو رہا ہے کیوں کہ حضرت اپنی تحریر میں اہلِ مظاہر علوم کے سامنے اپنے مستقل بالرائے ہونے کے لئے بطور مثال یہ جملہ لا رہے ہیں۔

"جیسا کہ اہلِ مدرسہ دیوبند نے کر کھا ہے۔ دیوبند کا حال آپ کو معلوم ہے کہ وہاں نزاع پیش آیا اور کیسے بڑے ذی وجاہت کا خلاف ہوا پر اہلِ مشورہ نے میری رائے کو اپنی اور سب کی رایوں پر مقدم رکھا خواہ ان کی فہم میں میری رائے آئی یا نہیں انھوں نے اس کو قبول کیا اور اس پر اڑے رہے اس کے خلاف ہرگز نہ کیا"

اس مذکورہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت گنگوہیؒ مروجہ جمہوریت کے بالکل خلاف دارالعلوم دیوبند میں بھی عمل فرما رہے ہیں پھر یہ کہنا کہ سو سال سے مدرسہ دیوبند مروجہ جمہوریت کے طریق پر چل رہا ہے اور شوریٰ کو بالادستی حاصل رہی ہے کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ خود غور فرمالیں۔

اس کے بعد حضرت نانوتوی رح کا مضمون آ رہا ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح کا ارشاد گرامی

مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو مشیر مدرسہ ہمیشہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو، اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کبھی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔ تاریخ دارالعلوم ص ۱۵۲ ج ۱

ایک ضروری توضیح

حضرت نانوتوی رح نے آخر میں جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ" ہاں اگر مہتمم نے کسی سے بھی نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

اس سے شوریٰ کی بالادستی کا شبہ نہ کیا جائے چونکہ از اول تا آخر پوری عبارت کے ملانے کے بعد اس کا مطلب بالفاظ دیگر یہ نکلتا ہے کہ اہلِ مشورہ میں سے ہر ایک دوستانہ شکایت کر سکتا ہے۔ چونکہ اگر حضرت نانوتوی رح کے ہاں شوریٰ کو بالادستی ہوتی تو ہر وارد و صادر سے مشورہ کو کافی نہ فرمایا جاتا، اور جب مہتمم پر شوریٰ کو بالادستی نہیں ہے تو ایسے موقع پر جہاں کسی سے بھی مشورہ نہ کیا گیا ہو دوستانہ شکایت ہو سکتی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جہاد کے موقع پر بعض منافقین کے اعذار پیش کرنے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا انتظار وحی جہاد میں ان کو شریک نہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی تو حالانکہ اسی وقت ہی وحی نازل ہو سکتی تھی، اور عدم شرکت جہاد کی اجازت کو منسوخ کیا جا سکتا تھا، مگر چونکہ یہ اصول بتلانا تھا کہ ایسے مواقع پر جو فیصلہ ہو گیا وہ باقی رہے گا اسلئے اس وقت تو منع نہیں فرمایا۔

بعد میں اللہ تعالےٰ نے مشفقانہ ارشاد فرمادیا:۔

عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ	یعنی اللہ نے آپ کو معاف کر دیا (سو غم
لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ	کھانے کی تو ضرورت نہیں ہے لیکن مشفقانہ
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ	کہتا ہوں کہ) کہ آپ نے انکو اجازت

لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِيْنَ ۝	کیوں دی جب تک کہ آپ کے لئے سچے لوگ نہ واضح ہو گئے اور آپ نے جھوٹوں کو نہ جان لیا۔

چنانچہ معارف القرآن میں آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب و مقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غایت تعلق "حضرت حق" جل مجدہٗ کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپؐ کا قلب مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالےٰ کی طرف سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے۔ اگر شروع میں لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کے الفاظ ذکر کر دئے جاتے جنمیں صورۃً جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا اس لئے اس سے پہلے عفا اللہ عنک فرما کر ایک طرف تو اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہو گیا جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف اس کی معافی کی اطلاع پہلے سے دیدی تاکہ اگلا کلام قلب مبارک پر زیادہ شاق نہ ہو۔

(معارف القرآن سورہ توبہ ج۴ ص۲۸۵)

اسی پر حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے آخری جملہ کو قیاس کر لیا جائے۔

اس کے بعد حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو۔

انتظامی اصول ہشتگانہ

(از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جن کو حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے اپنے زمانۂ اہتمام میں بدست خود تحریر فرمایا ہے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی عابد حسین صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اکابر ثلثہ کے دستخط اسپر موجود ہیں۔ یہی حضرات اس زمانہ میں مدرسہ کے اہلِ شوریٰ تھے۔ وہ تحریر یہ ہے:۔

(۱) ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بناء ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہیئے، اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب اہلِ مشورہ میں سے دخل نہ ہو الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرماویں۔ جیسا اہل شوریٰ ملکر پسند کریں مقبول ہوگا۔

(۲) امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہیئے۔

(۳) جس کسی صاحب کو خواہ اہلِ شوریٰ، خواہ اور عام خلق کوئی امر قابلِ اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں۔ جلسۂ مشورہ میں پیش کر کے اس کو طے کر لیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔

(۴) مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں گے اگرچہ اس کی ہی

کسی بات پر خوردہ ہو اور یوں اہلِ شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا

(۵) مہتمم اگر اہلِ شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام میں انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

(۶) آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیوں کہ صرفِ ضروریہ کے لئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کرے گا تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔

(۷) ہر روز وقت مقررہ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔

دستخط دستخط دستخط

العبد محمد قاسم العبد ذوالفقار علی العبد محمد عابد (تحریر ۳ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ)

ان اصول سے صاف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ امور انتظامیہ میں مہتمم نے خود کو مختار رکھا ہے اور اہلِ شوریٰ کا کام صرف مشورہ دینا صاف تحریر ہے۔ اور اس پر اکابر ثلثہ کے دستخط ہیں جو اس وقت اہل شوریٰ تھے۔

شاید کسی کو ۳ سے شوریٰ کی بالاتری کا شبہ ہو لیکن بنظر تعمق کوئی شبہ کی بات نہیں کیوں کہ اس میں منازعت و کشاکشی کی صورت میں مہتمم نے ادارہ کو مزاحمت سے بچایا ہے اس طرح کہ اختلاف و خلاف ختم ہو کر

ادارہ منازعت سے محفوظ رہے اور ادارہ کو منازعت سے محفوظ رکھنا مہماتِ امور میں سے ہے۔

اسی لئے شریعت نے فتنہ کی بات سے محفوظ رہنے کا خاص اہتمام فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے الفتنۃ اشدّ من القتل کہ فتنہ کی بات قتل سے بھی زیادہ بھاری ہے اس لئے فرمایا کہ جزئیہ متنازعہ فیہ کو شوریٰ سے متفقہ طور پر طے کرالیا جائے تاکہ ادارہ میں کوئی نزاع نہو کیوں کہ اختلاف شوریٰ کی صورت میں پھر منازعت رہے گی۔

حاصل یہ کہ رفعِ منازعت کی یہ واقعۂ جزئی میں ایک صورت ہے اس سے شوریٰ کی بالاتری ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ پہلے دو نمبروں سے صاف ظاہر ہے۔

اس کے بعد حضرت مجدد تھانوی رح کا مجموعۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

اشرف الانتظام
فی
الشوریٰ والاھتمام

از

افادات حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی قدس سرہٗ

جس میں سنہ ۱۳۴۰ھ سے سنہ ۱۳۶۰ھ تک کے بیانات سے
اہتمام و شوریٰ کی شرعی و عقلی حیثیت اور دورِ اکابر
میں دارالعلوم دیوبند کا اس سلسلہ میں طرزِ عمل
وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

شخصیت ہی منقول اور معقول ہے

(۱) ارشاد فرمایا، بدون شخصیت کے نہ کام ہوسکتا ہے نہ انتظام، یہ تجربہ کی بات ہے۔ (الافاضات ص۵۲۹ ج۴ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۲) ارشاد فرمایا، جو قوت، شوکت، ہیبت شخصیت میں ہے جمہوریت میں خاک بھی نہیں۔ شخصیت بڑی برکت کی چیز ہے (الافاضات ص۲۶۲ ج۴ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۳) ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ یہاں پر تو ساری باتیں ہی نرالی ہیں جیسی نماز خانقاہ میں ہوتی ہے ایسی شاید کہیں ہوتی ہو۔ دریافت فرمایا کہ یہ کیوں؟ عرض کیا کہ قریب قریب سب جگہ پر یہ حالت ہے کہ امام کو ذرا دیر ہوجائے فوراً غل مچ جاتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ یہاں پر یہ بات نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر جمہوریت نہیں شخصیت ہے یہ اس کی برکت ہے (الافاضات ص۱۳۳ ج۱)

(۴) ارشاد فرمایا اجتماعی کاموں میں عقل کی بات یہ ہے کہ ایک معتمد شخص ہو اور سب اس کے ماتحت "ہوں" (فیوض الرحمٰن ص۲۶)

(۵) ارشاد فرمایا یہ بات اصول شرع اسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اپنی اعانت کے لئے دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اُسے مستحضر ہوجاتے ہیں، جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ اُن میں سے جو پہلو خود انتخاب کرلے اسی کا حکم دے دے یہی طریق

مشروع و معقول ہے (دعوت تبلیغ مطبوعہ پاکستان)

(۶) ارشاد فرمایا کہ آج کل جو اسلامی سلطنتیں کہلاتی ہیں ان پر بھی یورپ کی تقلید کا بھوت سوار ہے ہر اسلامی سلطنت میں جمہوریت قائم ہو گئی جس پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ مگر معلوم نہیں کہ فاذا عزمت کی کیا تفسیر کریں گے کیوں کہ اس میں تو تصریح ہے کہ بعد مشورہ کے مدار صرف ایک ہی کے عزم پر ہے جو صاف شخصیت ہے (الافاضات ص ۲۶۲ ج ۵ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۷) ارشاد فرمایا کہ "اس آیت وشاورھم سے" یہ مقصود نہیں کہ آپ ان پر شخصی حکومت نہ کریں بلکہ جمہوری حکومت کریں جیسا کہ بعض عقلمندوں نے سمجھا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے بعد فاذا عزمت، تنہا حضورؐ کی طرف منسوب نہ کیا جاتا بلکہ فاذا عزمتم یا اذا عزم اکثرکم ارشاد ہوتا۔ فاذا عزمت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ عزم میں صحابہ کے تابع نہ تھے۔ اس سے جمہوریت کوئی چیز نہیں رہتی (الصبر بالصبر)

(۸) صحیح رائے پر عمل کرنا بدوں شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے مطابق اکثر غلط ہی ہوگا۔ تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا (تقلیل الاختلاط)

(۹) جو لوگ جمہوریت کے مدعی ہیں اخیر میں وہ بھی شخصیت ہی سے کام

لیتے ہیں چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ اختلاف کے وقت والیسرائے کو اختیار ہوتا ہے۔ کہ جس شق پر چاہے عمل کرے۔ اسی طرح بادشاہ کو اختیار ہے کہ جب چاہے پارلیمنٹ کو توڑ دے۔ غرض سب کو اسی طرف آنا پڑا اخیر میں شخصیت ہی رہ جاتی ہے خود وہی جمہوریت والے چاہتے ہیں کہ ہماری شخصیت رہے۔ یہ قدرتی بات ہے، قانونِ قدرت کو کون مٹا سکتا ہے۔ (الافاضات ص۴۰ ج۵) ۱۳۵۱ھ

ے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ جماعت اسلاف واکابر کے ایک عظیم فرد ہیں انکے بیانات کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور کے طرز عمل کو رسالہ "الوحدۃ فی الاسلام" سے ملاحظہ فرمایئے! جس سے حکیم الامت رح کے ارشادات کی پوری تائید ہوتی ہے یہ رسالہ اسی کتاب میں آگے آرہا ہے تحریر فرماتے ہیں کہ!۔

چونکہ دارالعلوم کے قرن اول میں بوجہ اتحاد مشرب وقیام مرکزیت کوئی اختلافی تجویز موجود نہیں نہ ہی ایسے اختلافات کے وقت رائے شماری وغیرہ کے اصول مدون ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف طور پر تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ بزرگان دارالعلوم کی نظر میں مرکزیت وامارت خاصہ شرعی ایک ضروری چیز تھی اور کارخانہ تعلیم دین کی بنا اسی اصول پر اُنھوں نے ڈالی جو ان کا علمی وعملی حیثیت سے ایک نہایت ہی ممتاز ومبارک اقدام تھا۔

یہ تھا ہمارے حضرات اکابر کا تعامل کہ ایک خیال ایک مشرب کے سب حضرات تھے اور سب نے ایک کو اپنا امیر اور بڑا سمجھ رکھا تھا، یہی اعتقاد تھا، یہی قانون تھا، یہی عمل تھا (ص۲۳) آگے فرماتے ہیں!۔

ان اکابر کا پورا پورا طرز عمل مثل آئینہ یہی واضح کر رہا ہے کہ مہمات مدرسہ کا مدار ایک ذاتِ مقدس پر ہوتا تھا۔ اور مرجعیت کاملہ اوس کو تفویض کیجاتی تھی اور ممبران شوریٰ برائے بیت اپنے کو سمجھ کر مدرسہ کی آبادی واسلوبی کے لئے مرجع الامر کے منشا کے مطابق مصروف فکر وعمل رہتے تھے یہی وہ اسلامی خلافت کا ذریں اصول تھا جسپر پہلے مسلمان عامل تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جمہوریت مروّجہ نہ معقول ہے نہ منقول ہے

(۱) ارشاد فرمایا یہ جمہوریت متعارفہ کیا ہے ایک لڑکیوں کا کھیل ہے اگر روٹی پکانے میں بھی جمہوریت ہو ایک روٹی بھی نہ پکے۔ اگر نسخہ تجویز کرنے میں بھی جمہوریت ہو تو مریض کبھی اچھا نہ ہو (الافاضات ص۵۴ ج۵ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۲) ارشاد فرمایا۔ مشورہ اور رائے تو مطلوب ہے مگر یہ مخترعہ متعارفہ جمہوریت محض کھڑا ہوا ڈھکوسلا ہے (الافاضات ص۲۶۶ ج۳ سنہ ۱۳۵۰ھ)

(۳) ارشاد فرمایا آج کل جمہوریت کو شخصیت پر ترجیح دی جارہی ہے اور کہتے ہیں کہ جس طرف کثرت ہو وہ سواد اعظم ہے، اس زمانہ میں میرے ایک دوست نے اس کے متعلق عجیب اور لطیف بات بیان کی تھی کہ اگر سواد اعظم کے یہ معنی مان بھی لئے جائیں کہ جس طرف زیادہ ہوں (انھیں کی بات واجب الاتباع ہو) تو ہر زمانہ کا سواد اعظم مراد نہیں بلکہ خیر القرون کا زمانہ مراد ہے جو غلبہ خیر کا وقت تھا۔ ان لوگوں میں سے جس طرف مجمع کثیر ہو وہ مراد ہے نہ کہ ثم یفشوا الکذب کا زمانہ کہ یہ جملہ ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اب مسلمان یورپ کی پیدا کردہ فضا کی وجہ سے اس کو بنظر حقارت دیکھ کر شخص پرستی سے تعبیر کرنے لگے ہیں حالاں کہ قرون اولیٰ میں اور خلافت حقہ کے زمانہ شباب میں انتخاب امیر کے بعد سوائے کتاب اللہ کے کوئی بھی قانون مدوّن نہ کیا جاتا۔ یہی وہ گُر تھا جس سے اگلے کامیاب ہوئے۔ (الوحدۃ فی الاسلام ص۲۵)

بتلا رہا ہے کہ بعد خیر القرون کے کثرت شر میں ہوگی مجھے یہ بات بہت ہی پسند آئی واقعی کام کی بات ہے (الافاضات ص ۳۱/۲ ج ۱ سنہ ۱۳۵۰ھ)

(۴) ارشاد فرمایا کہ سواد اعظم کا (فی زماننا) مشہور مفہوم تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں جس طرف کثرت ہو "مگر" میں کہتا ہوں کہ یہ مراد نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ خیر القرون میں جس عقیدہ کی طرف کثرت تھی۔ (وہ کثرت اور جماعت مراد ہے) کیوں کہ اس وقت (اہل اسلام میں) اہل باطل کم تھے، اہل خیر زیادہ تھے۔ اس وقت کسی طرف کثرت ہونا علامت تھی اس کے حق ہونے کی۔ اس وقت کا سواد اعظم مراد نہیں اور وہ بھی عقائد میں کثرت مراد ہے، آراء میں (یعنی رایوں میں) کثرت مراد نہیں۔

(الافاضات ص ۴۰۳/۵ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۵) ارشاد فرمایا آج کل نہ اُستاد کی پرواہ ہے نہ باپ کی نہ پیر کی عجیب گڑبڑ پھیل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا سے خیر و برکت اُٹھتی چلی جا رہی ہے جمہوریت جمہوریت گاتے پھرتے ہیں یہ سب اسی کی نحوست ہے کہ چھوٹے چھوٹے رہے نہ بڑے بڑے رہے اور علاوہ ان آثار کے خود مقصود کے اعتبار سے بھی یہ جمہوریت ایک کھیل ہے جو قوت، شوکت، ہیبت شخصیت میں ہے جمہوریت میں خاک بھی نہیں اس میں نہ مستحکم انتظام ہو سکتا ہے نہ کوئی وزنی کام ہو سکتا ہے (الافاضات ص ۴۶۲/۴ سنہ ۱۳۵۱ھ)

(۶) آخر یہ جمہوریت معلوم نہیں کہاں سے نکالی ہے اس کے نتائج بھی بھگت رہے ہیں اپنی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں مگر جو زبان سے ایک دفعہ نکل گیا ہے قیامت آجائے مگر اس سے نہ ہٹیں اس قدر نفس پروری کا زمانہ ہے۔ تجربہ ہو گیا مشاہدہ ہو گیا

لیکن اڑے ہوئے ہیں (الافاضات ص۵۴ ج۵)

(۷) ارشاد فرمایا آج کل جمہوریت کا زور ہے۔ اس کی ترجیح میں کہتے ہیں کہ شخصیت اس لئے مضر ہے کہ ایک شخص کا کچھ اعتبار نہیں۔ دین فروشی کردے، ملت فروشی کردے، قوم فروشی کردے۔ اسی لئے جمہوریت قائم کرنے کی چیز ہے لیکن غور کرنے سے اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ تمہارے تمدن میں نالائق بھی حاکم ہوسکتا ہے جس میں یہ احتمال ہوسکتے ہیں۔ اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ بادشاہ لائق ہو ایسے شخص کا انتخاب کرو جس پر یہ احتمالات ہی نہوں۔ اور جیسے شبہات تم نے شخصیت میں نکالے ہیں ایسے شبہات جمہوریت میں بھی ہوسکتے ہیں جس کے انسداد کے لئے تم نے جماعت کا انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ ایسے واقعات بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ اب اس کے بعد دیکھ لو کہ کون سی بات عقل کے موافق ہے اور کون نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رعایا پر جو ہیبت ہوتی ہے وہ شخصیت ہی سے ہوتی ہے۔ جمہوریت اور جماعت سے ایسی ہیبت نہیں ہوتی اور نہ اس درجہ کی ترغیب کام کی ہوسکتی ہے اس لئے کہ طبعاً اس کا بھی خاص اثر ہوتا ہے کام کرنے والوں پر کہ ہمارے اس کام سے امیر، یا سردار خوش ہوا، اس سے ان کا دل بڑھتا ہے اور جمہوریت میں کوئی خوش ہونے والا معین نہیں اس لئے کسی کی خوشی کا اثر ہی کیا ہوگا، آج ایک جماعت انتخاب میں ہے کل دوسری ہے بس، اور شخصیت میں رعایا اور حاکم میں خاص تعلقات ہوتے ہیں جس کو اہلِ ذوق اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ (الافاضات ص۱۴۳ ج۴) ۱۳۵۱ھ

(۸) ارشاد فرمایا کہ جن مفاسد کیوجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابی بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے حالاں کہ ممکن ہے کہ کسیوقت اس کی رائے غلط ہو اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔

میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا بھی احتمال ہے اسی طرح ایک جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور جماعت کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہے کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برق کو ایجاد کیا، ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجد اکثر شخص ہوتا ہے اور اسی کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہونچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے۔ (تقلیل اختلاط)

کثرتِ رائے پر مدار کی حقیقت

ارشاد فرمایا کہ :-

(۱) آج کل اکثر امور میں مطلق کثرتِ رائے کے لئے ایک قاعدہ نکلا ہے کہ کثرت کی طرف فیصلہ کیا جائے مگر اس میں اوّل تو یہ کلام ہے کہ جس کو آپ کثرت سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں کثرت نہیں کیوں کہ تم نے دس پندرہ یا چالیس پچاس آدمیوں کو جمع کر کے ان سے رائے لے لی اور کثرت پر فیصلہ کر دیا حالاں کہ کروڑوں آدمی ابھی ایسے باقی ہیں جن سے رائے نہیں لی گئی ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم کو عوام سے رائے لینے کی ضرورت نہیں بلکہ عقلاء کو انتخاب کریں گے اور ان کی کثرت پر فیصلہ کا مدار رکھیں گے تو میں پوچھوں گا کہ عقلاء کس معیار سے منتخب کئے جائیں گے ؟ اور اس معیار کے صحیح ہونے کی کیا دلیل ؟ اگر انتخاب عقلاء کا معیار تم نے اپنی ذاتی رائے سے قائم کیا تو تمہاری رائے کے غلط نہ ہونے کی کیا وجہ ؟

حقیقت میں فیصلہ ہمیشہ شخصی رائے سے ہوتا ہے کیوں کہ کثرت رائے کے حاصل کرنے کا جو معیار تجویز کیا جاتا ہے وہ شخصی رائے سے تجویز ہوتا ہے اس میں خوب غور کرو یقیناً انتہاء شخصی رائے پر ہوگی ۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اس کثرت رائے کے فیصلہ میں بھی وہ خرابی موجود ہے جو شخصی رائے میں بیان کی جاتی ہے کیوں کہ کثرت رائے کے فیصلہ سے بھی رعایا کی حرّیت باطل ہوتی ہے جس کا آج کل بہت چرچا ہے کہ مساوات اور حرّیت ہونا چاہیئے یہاں تک کہ عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق دینے کا

مطالبہ کیا جاتا ہے مگر میں پوچھتا ہوں کیا پارلیمنٹ کے سب قوانین رعایا کی رائے کے موافق ہوتے ہیں؟ بلکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی رائے کے خلاف ہوتے ہیں تو کیا اس صورت میں کثرتِ رائے سے حریت باطل نہیں ہوتی؟ — جب کثرت رائے سے بھی حریت کا ابطال ہوتا ہے اور وہی صبر و استقلال اس میں بھی ہے جو شخصی رائے میں ہے تو اب بتلایئے کہ ایک شخص کی غلامی اور استبداد سے پارلیمنٹ کی غلامی اور اس کا استبداد کیوں افضل ہے؟ یقیناً بیس پچاس آدمیوں کی غلامی سے ایک کی غلامی بہتر ہوگی۔ (غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح)

(۲) ارشاد فرمایا جہاں بظاہر کثرت رائے کا مدار ہے وہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہوتی ہے پھر اُن سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھایا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہدینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں۔ اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے سب لوگ مقلد ہوتے ہیں۔ باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔

مکالمہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی مع سرسید احمد خاں

(۳) ارشاد فرمایا مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سرسید احمد خاں سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہیں کیوں کہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ دُنیا میں عُقلاء کم ہیں اور بے وقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بناء پر کثرتِ رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا

فیصلہ ہوگا ۔ "سر" سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بے وقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیفما اتفق جمع کر لیا جائے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہونگے لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفما اتفق جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں عقلاء ہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی ۔ مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہوتے ہیں ناقص العقل زیادہ، چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک ہی دو ہوتے ہیں تو عقلاء میں بھی کثرت انھیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا ۔ سر سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا ۔ بالکل ہی خاموش ہو گئے ۔ (تقلیل اختلاط)

(۳) ارشاد فرمایا کہ بتلایئے کہ اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہو اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا ۔ جمہوری سلطنت میں کثرتِ رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے ۔ وہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا ۔ اگر وزراء کی رائے صحیح معلوم ہوئی اس پر عمل کر لیتا ہے اگر وزراء کی رائے غلط معلوم ہوئی تو وہ اپنی صحیح رائے پر عمل کر سکتا ہے ۔ اور جمہوری

میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی بھی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔ (تقلیل اختلاط)

(۴) ارشاد فرمایا جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں اور بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابلِ اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے۔ تو ایسے کو بادشاہ بنانے ہی کی کیا ضرورت ہے جسکے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بنا ؤجو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو، مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے اور صائب العقل، رزین (باوقار) سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی (اور ظاہر) ہے (تقلیل الاختلاط)

(۵) ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) میں ممبران کی کمیٹی قائم ہے اور کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے اور اس کو سواد اعظم سے تعبیر کرتے ہیں، اس ہی معنی کی بنا جمہوریت کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا سواد اعظم سے مراد تو بیاض اعظم ہے یعنی نور شریعت جس جماعت میں ہو۔

(الافاضات ص۴۴ ج۱) ۱۳۵۰ھ

(۶) اتبعوا السواد الاعظم میں اگر کثرت عددی ہی مراد ہو تو سواد اعظم سے

مراد خیر القرون کا سواد اعظم ہے کہ اُس (زمانہ) میں اہل خیر غالب اور کثیر تھے (الکلام الحسن ص۴۱)

(۷) مشورہ جو مسنون ہے تو اس مصلحت کے لئے کہ تمام شقیں سامنے آجائیں پھر ان میں سے ایک شق کو ترجیح دیدی جائے لیکن اس انتخاب کے لئے کثرت رائے صحیح طریقہ نہیں جیسا کہ اس وقت عام مذاق ہوگیا ہے۔ (الافاضات ص۳۹ ج۱) سنہ ۱۳۶۰ھ

جمہوری سلطنت پر استدلال اور اسکا ابطال

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وشاورھم فی الامر مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں جو مشورہ کا درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا اگر نبی، اور خلیفہ تو بدرجۂ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دے تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مشورہ[1] پر عمل نہ کیا تو حضورؐ ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے

---

[1] شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حدیث بریرہ میں مشورہ کا لفظ نہیں آیا شافعؐ یا اشفع (باقی صفحہ آئندہ پر)

نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ اُن پر کچھ عتاب ہوا۔ تو جب اُمت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو تو نبی، یا خلیفہ، رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس وشاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کر لیا کریں۔ اور" یہ کہاں ثابت ہوا کہ" اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک وشاورھم سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ انکے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کہ مشورہ کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آیا ہے جس کے معنی سفارش کے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سفارش بھی مشورہ کی ایک صورت ہے چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں مباح میں آج کل میں سفارش کو جائز نہیں سمجھتا۔ آجکل کا رنگ دیکھ کر میں مباح میں سفارش کرنے کو جبر سمجھتا ہوں، مخاطب پر ایک قسم کا بار ڈالنا ہے جو شرعاً بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر ایسی سفارش ہو کہ یہ یقین ہو کہ مخاطب بالکل آزاد رہے گا۔ چاہے عمل کرے یا نہ کرے یہ سفارش بیشک جائز ہے۔ اور یہ سفارش حقیقت میں مشورہ کی ایک فرع ہے۔ باقی جس سفارش میں یہ احتمال بھی ہو کہ مخاطب خلاف نہ کر سکے گا۔ ایسی سفارش کرنا گویا تنگ کرنا ہے اسکو میں شرعاً جائز نہیں سمجھتا۔ (الافاضات ص ۳۲۵ ج ۳)

جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کرکے اس پر عمل کریں۔
یہاں فاذا عزمت صیغۂ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ـــــ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے۔ کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں، اہلِ مشورہ ان کو مشورہ سُننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیوں کہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہانتک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے ہوئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی ثابت تو کرے۔

بس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور

جس آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلا دیا کہ اس سے استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ اگر غور کریں تو اسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہو رہا ہے۔

اور اس آیت میں فتوکل علی اللہ جو حق تعالےٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے، یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہو سکتی ضرور اس میں غلطی ہو گی اس کا جواب فتوکل علی اللہ میں دیا گیا ہے سبحان اللہ حق تعالےٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہو گی اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہو گا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی اس لئے پہلے ہی سے اس کا جواب دیدیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔

اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کر کے دیکھ لو معلوم ہو جائے گا کہ بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے مگر اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی اور تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔

چنانچہ آجکل یہ جواب دیکر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو مخاطب کبھی اسکو اتفاق پر محمول کرے گا، کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں تو اکثر کی رائے صحیح تھی مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی۔ مگر اسباب خارجہ ایسے پیش آگئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہو گئی۔ وعلیٰ ہذا ——— کچھ نہ کچھ تو جیہیں نکال لی

جائیں گی مگر حق تعالےٰ نے یہ جواب نہیں دیا، حق تعالےٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہوجائے۔

قرآنِ پاک کا طرزِ جواب

قرآنِ پاک میں مقدمات اور صغریٰ کبریٰ اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے گفتگو قطع (یعنی ختم) نہیں ہوتی "چونکہ" مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ (لہٰذا ایسا جواب نہیں دیا جاتا) بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اسی خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو فتوکل علی اللہ میں دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہوجائے تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل شروع کردے تمہارے ہاتھ میں خزائن کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں تم خدا پر بھروسہ کرکے عمل کرو۔ حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کرسکتے ہیں۔ بلکہ وہ رائے اگر غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہوجائے گی۔ اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہوجاوے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیئے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیئے وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کرسکتے ہیں (تقلیل الاختلاط)

اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ وشاورھم سے صرف مشورہ کا مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔

کثرت رائے پر فیصلہ کا اصول اس سے ثابت کرنا بالکل غلط ہے۔ فاذا عزمت سے شخصیت کا ثبوت ہو رہا ہے، اب تفسیر بیان القرآن میں اس مقام کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:۔

بیان القرآن ایسی تفسیر ہے جس کے متعلق حضرت مرشدی حکیم الامت قدس سرہٗ کا یہ ارشاد ہے کہ تفسیر بیان القرآن میں سب الہامی مضامین ہیں جو کچھ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے الفاظ ومعانی الہام فرمائے ہیں بعینہٖ میں نے وہی لکھے۔ بجز دو ایک مقام کے جن کی میں نے نشان دہی کر دی ہے۔ یہ تفسیر میں نے کامل شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے۔ (مآثر حکیم الامت ص۱۲۸)

اس تفسیر میں تحریر ہے لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرائے والمشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے۔ ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔ بیان القرآن کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ انتظامی امور میں کثرتِ رائے سے فیصلہ کئے جانے بلفظ دیگر شوریٰ کے تحت انتظام چلانے، شوریٰ کے منتظمہ ہونے کا ضابطہ واصول خلاف شریعت ہے حضرت والا کے الفاظ "کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ شرعاً غلط ہے، خلافِ شریعت ہے، چنانچہ اغلاط العوام میں ایسے الفاظ کا یہی مطلب ہے، مثال کے طور پر دو مسئلے ملاحظہ فرمائیں۔

مسئلہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں جانور کے بولنے سے موت پھیلتی ہے سو یہ بے اصل ہے۔

مسئلہ مشہور ہے کہ چارپائی پر نماز پڑھنے سے بندر ہو جاتا ہے، سو محض بے اصل ہے۔ یہاں دونوں مسئلوں میں شگون وبدفالی کی بات مذکور ہے۔

اور حدیث میں لاطیرۃ وارد ہے تو شریعت کا اصول بدفالی کی نفی اور ممانعت کا ہے۔ پس شگون لینا، بدفالی کرنا ظاہر ہے کہ غلط اور شریعت کے خلاف ہے اسی کو حضرت والا نے "بے اصل" اور محض بے اصل ہے" سے تعبیر فرمایا ہے نیز گذشتہ صفحات میں تصریحاً غلط فرمانا گذر چکا ہے، پھر ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہے۔ "یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرتِ رائے پر فیصلہ کیا جائے"۔ علاوہ ازیں جمہوریت اور کثرتِ رائے کے اصول کی حضرت والا ہمیشہ تردید اور ابطال فرماتے رہے۔ اور اس کے برخلاف شخصی نظام کے شرعی و عقلی ہونے کو ہمیشہ بیان فرماتے رہے۔

جیسا کہ ۱۳۴۰ھ سے لیکر ۱۳۵۱ھ بلکہ ۱۳۵۲ھ تک کے ملفوظات وارشادات ملاحظہ فرما چکے۔ اب پھر بعض ارشادات مکرر ملاحظہ فرمائیں:۔

۱ ارشاد فرمایا پس وشاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں، یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں۔ اور یہ کہاں ثابت ہوا کہ "اگر کثرتِ رائے بادشاہ کے خلاف ہو تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہے

۲ ارشاد ہے فاذا عزمت اس میں تو تصریح ہے کہ بعد مشورہ کے مدار صرف ایک کے عزم پر ہے، جو صاف شخصیت ہے۔

۳ اور ارشاد ہے۔ یہ بات اصول شرع اسلام سے ہے کہ کام در اصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے وہ اپنی اعانت کے لئے دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس امیر کار" کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کر لے اسی کا حکم دیدے۔ یہی طریق مشروع ومعقول ہے۔ دیکھئے حضرت والا مشروعیت اور شرعی ہونے کو شخصیت میں

منحصر فسرمار ہے ہیں جس سے غیر شخصیت یعنی جمہوریت اور کثرتِ رائے ونظام شورائی مروج کا غیر شرعی اور خلافِ شرع ہونا صاف ظاہر ہے۔

اصل مقصود تو حضرت والا (حکیم الامت مولانا تھانوی) ہی کے ارشادات نقل کرنا ہے لیکن ضمناً واستطراداً مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح کی تفسیر معارف القرآن سے بھی پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اولاً بطورِ سوال تحریر فرماتے ہیں کہ، اگر اختلاف ہوجائے تو کیا آج کل کے پارلیمانی اصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا یا اس کو اختیار ہوگا کہ اکثریت ہو یا اقلیت، جس طرف دلائل کی قوت اور مملکت کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے؟ ——— اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب نہایت شرح صدر سے تحریر فرماتے ہیں۔

قرآن وحدیث اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلافِ رائے کی صورت میں امیر، اکثریت کے فیصلہ کا پابند ومجبور ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعامل صحابہ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کرسکتا ہے خواہ اکثریت کے مطابق ہو، یا اقلیت کے۔ البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لئے سببِ اطمینان بن سکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں غور فرمایئے! اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ اس میں عزمت

کے لفظ میں عزم یعنی نفاذ حکم کا پختہ ارادہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا، عزمتم نہیں فرمایا جس سے عزم و تنفیذ میں صحابہ کی شرکت معلوم ہوتی اس کے اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد نفاذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بعض وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ ابنِ عباس رضؓ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے۔ حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہ موجود ہوتے تھے جو ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے عمر اور علم میں زیادہ ہوتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی رائے کو جمہور صحابہ کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے حتیٰ کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیت مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ لینے کے لئے نازل ہوئی۔ (معارف القرآن ص ۲۲۵/۲)

معارف القرآن سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) قرآن وحدیث اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تعامل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف کی صورت میں امیر اکثریت کے فیصلہ کا پابند و مجبور ہے

(۲) قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث و تعامل صحابہ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے۔

(۳) مشورہ کے بعد نفاذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے۔

(۴) بہت مرتبہ حضرات شیخین کی رائے کو جمہور صحابہ کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔

(۵) حضرت عمرؓ نے بعض اوقات صرف ابن عباسؓ کی رائے پر فیصلہ نافذ فرمایا ہے "جمہور صحابہ کی رائے کو ترک فرمادیا"۔

اس سے ثابت وظاہر ہے کہ امیر کے اطمینان اور شرح صدر کا اعتبار ہے مشورہ کے بعد جس رائے پر بھی وہ مطمین ہوجائے اسی کو نافذ کردے ——— دور اکابر میں مہتمم اور شوریٰ میں باہم مناسبت اور اتحاد ذوق کے سبب اکثر مہتمم کو ان کی بات پر شرح صدر ہوجاتا تھا اور وہ مجبور ہوکر نہیں بلکہ اپنے اختیار و شرح صدر سے اس رائے کو نافذ کرتا تھا۔ تو اس سے بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ مہتمم تابع ومحکوم ہے اور شوریٰ متبوع وحاکم ہے لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اصل مہتمم ہی ہے مدرسہ کا پورا عملہ اس کے ماتحت ہے اور مجلس شوریٰ مہتمم کے لئے حاکم نہیں بلکہ اس کے لئے معاون اور مددگار ہے۔

مہتمم اگر افراد شوریٰ کے معظم ومحترم ہونے کی وجہ سے ادب واحترام کا معاملہ کرے ان کی بات مان لیا کرے تو شوریٰ کا حاکم ہونا اور مہتمم کا محکوم وتابع ہونا اس سے ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا لہٰذا اس کو سند بناکر بعد والوں کو زبردستی وہی حیثیت پانے حاصل کرنے کے لئے مہتمم کو ماتحت اور محکوم قرار دیتے ہوئے اپنی رائے کو زبردستی منوانے اور مہتمم کو اس رائے کا پابند اور مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا۔

چنانچہ اکابر کے دیکھنے والے اور ان کے طور وطرز سے پوری واقفیت

رکھنے والے حضرت تھانوی رح فرماتے ہیں کہ :۔ مستشیر کا التزام عمل مشیر کے قبول اختیارات و مطالبۂ عمل کو مستلزم نہیں (رابعۃ التابعہ النور ماہ صفر ۱۳۴۶ھ) نیز ارشاد فرمایا۔ میں نے جن بزرگوں کو مدرسہ میں کام کرتے (یعنی مدرسہ کا اہتمام کرتے) دیکھا ہے ان میں کامل استبداد و استقلال تھا۔ کسی امر مہتم عظیم الشان میں مشورہ فرما لیتے تھے (یعنی ہر ہر چیز میں یا اکثر امور میں مشورہ نہیں فرماتے تھے۔ کسی کسی امر میں اور کبھی کبھی مشورہ فرما لیتے تھے) ورنہ جو چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ طالب علم تو کیا مدرس بھی کان نہ ہلاتے تھے (آج جو جمہوریت اور اکثریت کے تحت نظام چلانے اور اس کے ضروری ہونے پر دلائل قائم کرتے ہیں) کیا ان کو جمہوریت کے احکام و دلائل معلوم نہ تھے (قند دیوبند ص ۹)

کثرتِ رائے کے غلط ہونے کی دلیل

اس سلسلہ میں حضرت والا ایک وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں ۔ جب غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی صف بندی کی تو ایک گھاٹی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی۔ اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت نہ ہٹنا گو ہمارے اوپر کچھ بھی گذر جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کفار پر حملہ کا حکم دیا تو تھوڑی ہی دیر میں کفار کو شکست ہوئی ۔ اب اس دستہ فوج میں جو گھاٹی پر متعین تھا اختلاف ہوا۔ بیان القرآن میں تحریر ہے عبداللہ بن جبیر صحابی کو پچاس تیر اندازوں پر افسر کر کے ایک مورچہ پر پشت لشکر کیطرف

مقرر فرمایا کہ اس مورچہ کی حفاظت رکھو تاکہ ہماری پشت کی طرف سے غنیم نہ آجاوے اور یہاں ہی سے تیر اندازی کرتے رہو چنانچہ بڑے موقعہ سے لڑائی شروع ہوئی اور مسلمان غالب آگئے۔ عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھی یہ سمجھ کر کہ یہاں پر ٹھہرنا معلل تھا خوف ضرر کے ساتھ اب تو ہمارے بھائی غالب ہو گئے۔ اب کیا اندیشہ رہا اس لئے وہ حکم ختم ہو گیا باستثنار بارہ آدمیوں کے سب اس جگہ سے جدا ہو کر کفار کے تعاقب میں چلے اور غنیمت کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے، کفار نے موقعہ پاکر مورچہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ کیا اب آگے بھی کفار پیچھے بھی کفار اور اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک بھی یعنی اس کا ایک ریزہ شہید ہو گیا۔ اور کسی کافر نے پکار دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہو گئے الخ اس قصہ کو نقل فرما کر فرماتے ہیں کہ یہاں سے آپ کو کثرت رائے کی حقیقت واضح ہو گئی کہ کثرت رائے کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں۔

(الصبر بالصبر)

حضرت کا وعظ محض الہامی ہوتا تھا چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث و فقیہ سہارن پوری فرماتے تھے کہ مولانا تھانوی کے وعظ میں کسی کو اُنگلی رکھنے کی بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ (الافاضات ص۲۸۲ ج۷ بلفظہٖ آخر)

❁

لہ وعظ ذم النسیان میں ہے مگر پہلی رائے والوں نے نہیں مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹکر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یہ اُنسے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے تھے۔

کثرتِ رائے کے فیصلہ کے غلط اور باطل ہونیکی نہایت قوی اور واضح دلیل

حضرت مرشدی حکیم الامت قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں۔ سب پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ہر شق کے مرجحات بھی اور موانع بھی سب دیکھنے چاہئیں۔ مشورہ جو مسنون ہے تو اسی مصلحت کے لئے ہے کہ تمام شقیں سامنے آجائیں پھر ان میں سے ایک شق کو ترجیح دیدی جائے لیکن اس انتخاب کے لئے کثرتِ رائے صحیح طریقہ نہیں جیسا کہ اس وقت عام مذاق ہوگیا ہے ـــــ کثرت رائے کے غیر صحیح اور غلط ہونے کی ایک خاص دلیل نہایت قوی اسیوقت ذہن میں آئی وہ یہ کہ جنگِ بدر میں ستر قیدی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں لائے گئے اس وقت تک اس کے متعلق کوئی نص نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رائے مبارک یہ تھی کہ کچھ فدیہ لیکر سب کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ تو بڑے رحیم وکریم تھے صحابہ کی بھی زیادہ تر یہی رائے ہوئی۔ کیونکہ اس میں مصلحت معلوم ہوئی اور مصلحت کھلی ہوئی تھی کیونکہ وہ سب قیدی بڑے بڑے سردار تھے یہ خیال ہوا کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے گا تو ان کی تالیف قلب ہوگی ممکن ہے کہ حضور کی شانِ کرم کو دیکھ کر ان لوگوں کو محبت ہو اور اسلام لے آئیں اور یہ رائے محض اس وجہ سے نہ تھی کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رائے مبارک

یہی تھی بلکہ خود صحابہ کی بھی آزادانہ رائے اسی مصلحت سے جس کا ذکر کیا گیا یہی تھی۔ اور مشورہ اسی لئے کیا بھی جاتا ہے کہ مختلف رائیں معلوم ہوں جن میں سے پھر مستشیر یا امیر ایک کو ترجیح دے سکے اور مشورہ کا حاصل یہی ہے کہ سب کی رائے ظاہر ہو جائے اسی لئے سب صحابہ نے آزادانہ اپنی رائے پیش کی تھی۔ اتنی بڑی جماعت میں صرف حضرت عمر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما اس رائے میں موافق نہ تھے کہ ان قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔ سارے مجمع میں ان دو بزرگوں کی یہ رائے تھی کہ یہ بڑے بڑے سردار ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے تاکہ کفر کی شوکت ٹوٹ جائے اور مسلمانوں کی یہ دھاک بیٹھ جائے کہ اوفوہ! انھیں اتنی قوت ہے کہ کسی جماعت کی پرواہ نہیں کی اور کسی کو تدبیر و تالیف قلب سے اپنے میں مدغم کرنا نہیں چاہتے سب سے مستغنی ہیں ——— جب رائے کا انتخاب ہوا تو یہی رائے منتخب ہوئی کہ فدیہ لیکر سب کو چھوڑ دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت دیکھئے صاف اسی کثرت رائے کی صورت تھی۔ اگر یہ طریقہ کثرت رائے کا حق ہوتا تو اسکے خلاف آیت کیوں نازل فرمائی گئی۔ اور آیت بھی کیسی سخت لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی تمہاری تقدیر میں پہلے سے خیر نہ لکھدی گئی ہوتی تو تم نے جو عمل کیا اس پر عذاب عظیم آتا۔ جب یہ آیت نازل ہو چکی تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا گیا کہ رو رہے ہیں۔ حضرات صحابہ نے پریشان ہو کر پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے۔ فرمایا میں نے دیکھا کہ عذاب قریب آگیا تھا لیکن رک گیا اور اگر نازل ہو جاتا تو سوائے عمر اور سعد بن معاذ کوئی نہ بچتا سب ہلاک ہو جاتے غلطی دکھانے کے لئے عذاب دکھلایا اور یہ دکھلانے

کے لئے اجتہادی غلطی معاف ہے عذاب کو ٹالدیا۔ بہرحال کثرت رائے کا باطل ہونا اس سے زیادہ کس دلیل سے ثابت ہوسکتا ہے۔ (الافاضات ص۳۹ ج۲ سنہ ۱۳۶۰ھ)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور انتظامی امور متعلقہ بالرائے میں اس کو ضابطہ و اصول بنادینا اور اس کی پابندی عائد کرنا حضرت والا کے نزدیک غلط اور باطل خلافِ شریعت تھا جس کو حضرت والا قدس سرہٗ ہمیشہ اپنے مواعظ و مجالس میں بیان فرماتے رہے۔

مہتمم کا منصب

عنوان سابق میں اچھی طرح واضح کردیا گیا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ اجتماعی کاموں میں جمہوریت اور کثرت رائے سے نظام چلانے کو بالکل غلط اور خلاف شرع قرار دیتے تھے۔ بس شخص واحد کو امیر کار اور اعلیٰ ذمہ دار قرار دیتے تھے اسی کو مطابق شریعت اور مطابق عقل فرماتے تھے۔ اب یہاں پھر بعض ارشادات کو نقل کردینا مناسب اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا (۱) بدون شخصیت کے نہ کام ہوسکتا ہے نہ انتظام یہ تجربہ کی بات ہے (۲) اور فرمایا جو قوت و شوکت و ہیبت (درستی انتظام کے موقوف علیہا) شخصیت میں ہیں جمہوریت میں خاک بھی نہیں (۳) اور فرمایا اجتماعی کاموں میں عقل کی بات یہ ہے کہ ایک شخص معتمد ہو اور سب اس کے ماتحت (۴) اور فرمایا یہ بات اصول شرع و اصول اسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی اعانت کے لئے دوسروں سے بھی رائے لے لیتا ہے، پھر سب پہلو سامنے آنے کے بعد

ان میں سے جو پہلو وہ خود انتخاب کرے اسی کا حکم دیدے۔ یہی طریق مشروع ومعقول ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) کے مہتمم کے اختیارات کو محدود کرنا بڑی ہی زبردست مضرتوں کا پیش خیمہ ہے۔ (الافاضات ص۱۹۸ ج۴ سنہ ۱۳۵۱ھ)

شوریٰ کا منصب

اب حضرت والا کے ارشادات کی روشنی میں شوریٰ کی حیثیت اور اسکا منصب ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) ارشاد فرمایا کہ اہل شوریٰ کا جو کام ہے۔ یعنی محض مشورہ وہ اس کام کو برابر انجام دیتے رہیں جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے مشورہ سے سرپرست کی رائے اور نظر محیط ہوجائے گی کیونکہ ایک شخص کی رائے اور نظر ہر وقت اور ہر کام میں محیط نہیں ہوتی اس لئے اہل شوریٰ کی ضرورت ہے اس سے زائد اہل شوریٰ کا کوئی منصب نہیں۔ (الافاضات ص۷۶ ج۳ سنہ ۱۳۵۰ھ)

(۲) ارشاد فرمایا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم ہے لیکن یہ حکم نہیں کہ ان کے مشورہ پر عمل کریں بلکہ عمل کے مطابق ارشاد ہے فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کہ مشورہ کے بعد آپ کا جو ارادہ ہوجائے اللہ پر توکل کرکے اس پر عمل کر لیجئے۔ اہل شوریٰ کی رائے کا اتباع ضروری نہیں۔ مشورہ کا حکم محض اس لئے ہے کہ اس کی برکت سے حق واضح ہوجاتا ہے

خواہ مشورہ دینے والوں کی رایوں میں سے کسی ایک رائے کا حق ہونا واضح ہوجائے یا سب رایوں کے سننے سے کوئی اور صورت ذہن میں آجائے جو حق ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص۱۰۱/۲)

(۳) ارشاد فرمایا کہ رائے اور مشورہ دینے کی حقیقت تو صرف یہ ہے کہ دوسرے کو اس امر کے متعلق رائے قائم کرنے میں اعانت اور سہولت ہوجاوے باقی رائے اس "مشورہ لینے والے" کو خود ہی قائم کرنی چاہیئے (انفاس عیسیٰ ص۱۴۸/۲)

(۴) ایک اور جگہ عہد صحابہ کی شوریٰ اور حکومت کا ذکر اس طرح فرمایا کہ یہ جمہوریت صحابہ ہے کہ رائے سب کی اور حکومت ایک کی۔

ان ارشادات سے نہایت درجہ ظاہر و باہر ہے کہ حضرت مرشد حکیم الامت مجدد الملۃ مولانا تھانوی قدس سرہٗ شوریٰ کی[عہ] حاکمیت و حکومت اور بالادستی کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ ہر ہر جگہ صاف صاف اس کے برعکس، حاکم اور امیر ایک ہی کو قرار دیتے تھے، نفاذ امر، اور تنفیذ احکام کو ایک ہی کے ہاتھ میں ہونا شریعت کی تعلیم فرماتے تھے۔

عہ اسلاف و اکابر دار العلوم دیوبند نے شوریٰ کو اسی حیثیت میں رکھا ہے چنانچہ رسالہ الوحدۃ فی الاسلام میں تحریر ہے کہ دار العلوم کا نظام شوریٰ قدیم محض اخلاص و للّٰہیت پر مبنی تھا نہ سرپرست و مربی جماعت کیلئے کوئی رسمی قوانین مقرر تھے نہ اہل مشورہ کی حیثیت اور انکا مرتبہ حکمرانی تھا (ص۲۳) جس طرح ہر گھر میں امور جزئیہ کی ذمہ داریاں ہوتی ہے اور امور کلیہ کا مرکز باپ ہوتا ہے اسی فطری بنیاد پر دار العلوم کی بنیاد ڈالی گئی یعنی مہتمم کو بمنزلہ ماں قرار دیا گیا اور سرپرست مرجع الامر کو بمنزلہ باپ کے اور مشیران مدرسہ بمنزلہ دوست و احباب کے قرار دیئے گئے (ص۲۴)

آج کی شوریٰ، اکابر کی شوریٰ کے طور طریق پر نہیں

کیا آج کل شوریٰ، اکابر کی شوریٰ کے مطابق ہے؟ اس کا جواب حضرت مرشد حکیم الامت قدس سرہٗ کی زبانی سُنئے فرماتے ہیں:-

"اس زمانہ میں ایک دم ایسی کایا پلٹ ہوئی ہے جس کا وہم گمان بھی نہ تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔ فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) کے ارکان اور مجلس شوریٰ سے گفتگو ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے بزرگوں اور ان کے مشرب کی ہوا تک نہیں لگی۔ ان لوگوں نے اس کے قبل ایک دل آزار خط لکھا تھا اس کے متعلق اُن سے گفتگو ہوئی اُنھوں نے چاہا تھا کہ مدرسہ کی دوسری جزئیات میں گفتگو کریں۔ میں نے منع کر دیا اور صاف کہدیا کہ میں اس بیہودہ تحریر سے منقبض ہوا اور ہوں اور رہوں گا۔ اول اس کو صاف کیجئے۔ اور میں نے ان کو اجازت دی کہ اس میں گفتگو کر لی جائے۔ اس پر جواب دیا گیا کہ جن صاحب کی طرف سے وہ تحریر آئی ہے ان کا طرز تحریر ایسا ہے باقی دل میں کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کی تکذیب نہیں کرتا مگر باوجود اس علم کے کہ ایک شخص کی تحریر کا یہ طرز ہے پھر اس سے کیوں لکھوایا مدرسہ کی سرپرستی کا مسئلہ پیش ہوا ایک صاحب نے کہا میری ذاتی رائے ہے کہ کلی اختیارات سرپرست کو ہونے چاہئیں وہ جو مصلحت اور مناسب سمجھیں احکام صادر کریں۔ اس پر ایک صاحب نے کہا کہ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ شوریٰ کو بالکل ہی

حذف کر دیا جائے۔

ایک ملفوظ میں یہ ہے (تحریر مذکور کے بعد) کہ آخر تہذیب بھی تو کوئی چیز ہے اس میں تہذیب بھی نہ تھی۔ میں نے سرپرستی سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ خط کا معاملہ تو ماضی کا ہے وہ تو مضیٰ ما مضیٰ مگر سرپرستی کا معاملہ مستقبل کا ہے جس میں مجھ کو ہر طرح کا اختیار ہے۔ منسوخ بھی کر سکتا ہوں باقی بھی رکھ سکتا ہوں میرے اختیار سے تو باہر نہیں مگر بقاء اسی وقت ہو سکتا ہے کہ حدود اور اصول شرعیہ سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ (الافاضات ۵ ر ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) کی سرپرستی میرے سر زبردستی تھوپی گئی۔ کرتے کراتے سب کچھ خود ہیں میرا تو محض نام ہی نام ہے کیا فائدہ ایسی سرپرستی سے مجھے خدمت سے انکار نہیں مگر خدمت طریقہ کے ساتھ لی جائے۔ اور یہ تو محض بے ڈھنگا پن ہے کہ نہ اصول ہیں نہ قواعد۔ (۱۶ ر ربیع الاول ۱۳۵۱ھ الافاضات ص ۱۹۶)

(۲) ایک صاحب کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ دوسروں کی کیا شکایت جب اپنے بزرگوں کے نام لیوا ہی پھسل گئے، اس قدر انگریزیت اور نیچریت کا اس زمانہ میں غلبہ ہوا ہے کہ پرانے پرانے لوگ ڈھل مل ہو گئے اب یہ آفت فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) میں بھی پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگ میری سرپرستی سے منقبض ہیں میں نے اس ہی بناء پر استعفاء دیدیا تھا مگر پھر آکر مجھ کو مجبور کیا گیا۔ میں نے مدرسہ کی مصلحت کی وجہ سے قبول کر لیا" پھر آگے ارشاد ہے:۔

اب مزید یہ معلوم ہوا کہ مدرسہ کا زیادہ حصہ کانگریس میں شریک ہو چکا ہے۔

یہ باتیں سُنکر اس قدر دل کو قلق ہوتا ہے کہ یا اللہ بالکل ہی کایا پلٹ ہوگئی اپنے بزرگوں کے طرز اور مسلک کو بالکل ہی خیرباد کہدیا۔ اور زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (الافاضات ص۴۶۵ ج۴) ۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۵۱ھ

(۳) ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے ان کے طرز پر چلنے کو جی چاہتا ہے، اور فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) میں جو کمی آئی وہ ان حضرات کا طرز چھوڑنے ہی سے آئی ویسے عمارت بھی بڑی ہے کام کرنے والوں کے القاب بھی بڑے بڑے ہیں، روپیہ بھی بہت ہے مگر جو اصل چیز ہے وہی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

(الافاضات ص۴۰ ج۴) ۸ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ

(۴) اور ارشاد فرمایا کہ اب تو کچھ ایسا انقلاب ہوا ہے کہ پرانے لوگوں میں بھی جدید باتوں کا زہریلا اثر پیدا ہوگیا ہے نیچریت کا غلبہ ہے اسلئے کوئی مفید تحریک نہیں چلتی۔ (الافاضات ص۱۸۹ ج۴) ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

(۵) ارشاد فرمایا کہ فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) کی سرپرستی میرے سر اصرار کرکے تھوپی گئی۔ کرتے کراتے سب کچھ خود ہیں میرا تو محض نام ہی نام ہے۔ کیا فائدہ ایسی سرپرستی سے (الافاضات ص۱۹۶ ج۴ ۱۳۵۱ھ)

الافاضات الیومیہ ص۴۲۶ ج۵ میں ہے فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) میں فساد کی رفتار تیزی پر ہے اور اصلاح کی رفتار سست ہے تو پھر فساد ہی غالب رہے گا اور فساد ہی کو قوت ہوگی" کسی نے " عرض کیا کہ حضرت رائے پوری فرمایا کرتے تھے کہ اس مدرسہ میں رہ کر غیبت سے بچنا مشکل

ہے۔" حضرت نے" فرمایا کہ پہلے تو غیبت ہی سے بچنا مشکل تھا جو ایک معصیت ہے اور اب تو نیچریت سے بچنا مشکل ہے جو کفر کی سرحد سے ملی ہوئی ہے یہ حالت ہو گئی ہے کہ قرآن و حدیث میں جو نیچری تحریف کرتے تھے وہ اب وہاں کے لکھے پڑھے کرتے ہیں بے حد شرم آتی ہے اب لوگ کہتے ہیں کہ ندوہ اور علی گڈھ میں اور فلاں مدرسہ (یعنی دارالعلوم میں) کیا فرق ہے؟ خیر صاحب جو ان کا جی چاہے کریں ان پر تو اختیار نہیں مگر اپنے پر اختیار ہے کہ ان سے علیحدہ ہو جائیں (الافاضات ص۴۲۶ ج۵ سنہ ۱۳۵۱ھ) بالآخر اپنے کو خود ہی معزول فرمالیا کسی کی خدمت میں استعفار پیش نہیں فرمایا۔ متن استعفار درج ذیل ہے:۔

"آج کل مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے ارکان نیز بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بنار برحسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا احوط ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت[1]

---

[1] ایک اخبار میں شائع کرادیا۔

[2] چنانچہ اوّل اوّل تو حضرت والا کی سرپرستی کی وہی نوعیت تھی جو حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی کی نوعیت تھی کہ کل اختیارات سرپرست کو ہوتے تھے شوریٰ کی متفقہ رائے کے بھی خلاف حکم نافذ کرنے کا پورا اختیار سرپرست کو رہتا تھا اور شوریٰ اور پورا مدرسہ اس کو بخوشی تسلیم کرتا تھا کوئی انکار و اعتراض مطلق نہ ہوتا تھا۔ پھر اول تبدیلی یہ ہوئی جس کا ذکر حضرت والا ہی خود فرما رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا:۔

"کئی سال ہوئے مدرسہ دیوبند کی مجلس شوریٰ میں یہ پاس ہو گیا تھا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کا مسئلہ بھی ہے اس لئے احتیاطاً و اخذاً بالعزیمۃ حضرت سید نا حسنؓ
کی سنت کے اتباع میں نفس سرپرستی ہی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں
جو حقیقت میں تجدید و اعادہ استعفاء سابق ہے (۱۴ رجب ۱۳۵۲ھ)

اس سے بالکل واضح اور نہایت ظاہر ہے کہ مجلس شوریٰ کی خود مختاری اور حاکمیت و بالادستی کی پوری بیزاری کے ساتھ تردید ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ بھی مجلس شوریٰ کی حاکمیت کو مانتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ سرپرست جو رائے قائم کرلے۔ گو وہ سب ممبروں کی رائے کے خلاف ہو، وہی نافذ ہوگا۔ مگر بعد میں شاہ صاحبؒ نے ترمیم فرمائی کہ (شوریٰ میں) اختلاف کی صورت میں تو یہی ہو۔ لیکن اتفاق کی صورت میں سرپرست کی رائے کی ضرورت نہیں اسپر ممبروں نے جھگڑا شروع کیا۔ مگر میں نے کہا یہ ترمیم منظور کرلی جاوے، مگر مجھ کو متفق ہونے پر مجبور نہ کیا جاوے، بلکہ اپنی رائے کو ظاہر کردوں گا، عمل نہ کرنے والوں کو اختیار ہوگا چنانچہ یہ منظور ہوگیا مگر اسپر بھی شور ہے کہ امیر المومنین کے اختیار دیدیئے گئے (الکلام الحسن قسط ۹ ص۵)

اس ملفوظ گرامی سے ظاہر ہے کہ باوجود اختیارات کے کم کردینے کے بھی دلوں میں ناگواری تھی۔ پورا اختیار بعض اہل شوریٰ اپنے ہی ہاتھ لینا اور حضرت کو بے اختیار کردینا چاہتے تھے لیکن مدرسہ کی مصلحت کی خاطر حضرت والا نباہنے ہی کی کوشش فرماتے رہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔ میں جو مدرسہ کی وجہ سے مدرسہ والوں کی موافقت کرتا تھا لوگ کہتے تھے کہ مولوی حبیب الرحمٰن سے متاثر ہے۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے خوب جواب دیا تھا کہ میاں جو زمانہ تحریک میں سارے ہندوستان کی مخالفت سے متاثر نہیں ہوا وہ ایک بیچارے مولوی حبیب الرحمٰن سے کیا متاثر ہوگا (الافاضات ص۳۵)

سراسر خلاف واقعہ اور محض غلط اور بالکل باطل ہے۔

ان صریح صریح ارشادات سے حضرت مرشد حکیم الامت تھانوی رح کا مسلک اور اہتمام و شوریٰ کا اصل حکم معلوم اور متیقن ہو چکا کہ اداروں و مدرسوں میں اصل ذمہ دار اور اعلیٰ اقتدار کا مالک اور امیر و حاکم مہتمم ہے اور شوریٰ اس کے لیے معین اور خیر خواہ اور محض مددگار ہے آمر و حاکم نہیں دور اکابر میں بھی یہی طریق اور معمول رہا۔ پس بعض حضرات کا یہ سمجھنا کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ بھی مجلس شوریٰ کو مہتمم پر بالا اور مہتمم کو اس کا ماتحت قرار دیتے تھے، یہ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ایک اشکال کا جواب

اور ان کا حضرت والا کی تحریر بعنوان اعلان عام سے استدلال کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ اعلان دارالعلوم دیوبند کے ایک انتشار اور شورش کے رفع کرنے کے لئے تحریر فرمایا تھا۔ بنار شورش یہ تھی کہ ایک اور اعلان اس سے قبل حضرت کی اجازت سے دارالعلوم میں ہوا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "بشرط اہلیت خاندانِ قاسمی میں اہتمام کو مرجح رکھا جائے" اور غرض اس اعلان کی حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی حق شناسی اور مدرسہ کی انتظامی مصلحت تھی۔ اور اس اعلان کی عملی صورت یہ ہوئی کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رح کو مدرسی کے ساتھ نائب مہتمم بھی تجویز کر دیا گیا۔ اس پر دارالعلوم میں زبردست شور و شغب اور شورش و فتنہ برپا ہو گیا۔ کہا جانے لگا کہ اہتمام کو وراثت بنا دیا گیا حالانکہ اہتمام

محل وراثت نہیں۔ اس کے دفعیہ کے لئے حضرت والا نے سرپرست مدرسہ ہونے کی حیثیت سے ایک طویل مضمون الکلم الطیب کے نام سے تحریر فرمایا جس میں اعلانِ سابق کی وضاحت فرمائی اور بتلا دیا کہ نہ اہتمام کو وراثت بنایا اور نہ ہمارے کسی جملہ سے اس پر دلالت ہوئی۔ جملہ مناصب اور عہدوں کیلئے اہلیت شرط ہوتی ہے وہ صراحتہً ہماری اس تحریر میں مذکور ہے۔ اسی مضمون "الکلم الطیب" کا یہ جزو اخیر ہے جو اعلان عام سے معنون ہے اور وہ مضمون یہ ہے:-

"یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ مولوی حافظ قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم دیوبند کی مدرسی کے ساتھ نیابت اہتمام کے لئے بھی نامزد کئے گئے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مہتمم ہی بنائے جائیں یا ہمیشہ کے لئے نائب مہتمم رہیں۔ مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدیل کا اختیار ہے۔ امید ہے کہ اب اس معاملہ میں کسی کو شبہ نہ رہا ہوگا۔"

تو یہ ہے وہ مضمون اعلان عام جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک وقتی و ہنگامی حالات کی بات ہے، وقتی مصلحت کا لحاظ کیا گیا ہے شورش اور فتنہ کو دبانا ہے واقعۃ حال لاعموم لھا کا مصداق ہے۔ صرف ایک وقتی و جزوی چیز ہے۔ اور وقتی چیز تقاضائے وقت کا ایک عارضی اثر ہوتا ہے اور اصول کلیہ کا اصلی اور دائمی معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وقتی حالات کے اثر سے مولانا محمد طیب صاحب نے نیابت اہتمام سے استعفاء بھی دیدیا تھا اور حضرت والا نے اس کو منظور بھی فرمالیا تھا۔ مگر یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ

اس کی منظوری کے یہ معنی نہیں کہ ان کو اہتمام کی خدمت کبھی سپرد نہ کی جائے گی۔

نیز تحریر ہے کہ اس موقعہ پر پہونچکر یہ معاملہ ختم ہوچکا تھا اور اذہان خالی ہوچکے تھے۔ لیکن اس واقعہ سے بہت ہی نزدیک وقت میں احقر کے قلب میں یہ امر وارد ہوا کہ مستقبل کے لئے ابھی سے کوئی مہتمم تجویز ہوجانا ضروری ہے کہ اس وقت نیابت پر مقرر ہو پھر موقع پر مہتمم بنا دیا جائے (اس سے ذرا آگے تحریر ہے) تو بجز مولوی محمد طیب کے کوئی شخص موزوں معلوم نہوا (الکلم الطیب ص۳)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ یہ صرف انتخاب مہتمم کے سلسلے میں تحریر ہے اس سے ہمیشہ کا انتظام اور مجلس شوریٰ کا حاکم ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ عموم لئے ہوتا ہے تو مسلّم اصول ہے کہ اس کا عموم محدود ہوتا ہے اس کو مراد متکلم سے متجاوز نہیں کیا جاتا۔ تو جب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا نظریہ و مسلک صریح ارشادات سے سامنے آچکا تو ان سے صرفِ نظر کرکے مطلب متعین نہیں ہوسکتا۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ یہ اعلان عام ۱۳۴۷ھ کا اور صریح ارشادات اس کے بعد ۱۳۶۰ھ تک کے ہیں، اس لئے بھی اعلان عام سے شوریٰ کی حاکمیت پر استدلال نہیں ہوسکتا، چونکہ یہ ارشادات جن میں شوریٰ کی حیثیت صرف مشورہ دینا اس سے زائد اور کوئی منصب ان کا نہونا مذکور ہے۔ یہ موخر ہیں تو اعلان عام منسوخ قرار دیا جائے گا۔

الغرض حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ان پیش کردہ ارشادات صریحہ

کثیرہ سے حضرت والا کا موقف و مسلک واضح ہے کہ وہ مہتمم کے مختار کل اور امیر مدرسہ ہونے اور مجلس شوریٰ کو صرف مشورہ دینے اور اس کے سوا اس کا کوئی منصب نہ ہونے کو علانیۃً ہمیشہ ظاہر فرماتے رہے۔ بفضلہ تعالےٰ اب یہ مسئلہ بالکل صاف اور حضرت کا مسلک نہایت واضح ہوگیا۔ حق تعالیٰ اس کو مقبول اور نافع بنائیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمدٍ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

اس کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح کا بیان لکھا جاتا ہے۔

فیصلہ سرپرست کی رائے پر ہے خواہ وہ قلت کی جانب ہو خواہ کثرت کی

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بیان

توضیح دفعہ ۴ مجلس شوریٰ مندرجہ ص ۳۹

از احقر حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند

سرپرست صاحب دارالعلوم کو ایسے اختیارات دینا کہ ان کی رائے خواہ قلت کی جانب ہو خواہ کثرت کی فیصلہ اسی پر ہوگا بظاہر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس میں وجہ استبعاد کچھ نہیں معلوم ہوتی اسلام کی حکومت شوریٰ کا طرز قرن اول میں یہی معلوم ہوتا ہے، بعد استشارۂ اہل الرائے خلیفہ عمل میں مختار ہوتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے دارالعلوم دیوبند میں قدیم سے سرپرستوں کو ایسے اختیارات دے گئے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہما کے زمانۂ خیر و برکت میں یہی طریق عمل تھا بایں ہمہ سرپرستانِ دارالعلوم نے کبھی ان اختیارات کو بے موقع استعمال نہیں فرمایا۔

ص ۶۴ روئیداد کارروائی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
ماہ شوال المکرم ۱۳۴۵ھ

اسکے بعد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا مضمون سپرد قلم کیا جارہا ہے۔

کثرت رائے پر فیصلہ دستور شرعی نہیں

(از)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

نصوص قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ وتابعین پر نظر ڈالنے سے بالاجمال اتنی بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ شریعتِ اسلام نے مشورہ کا فیصلہ درصورتِ اختلاف کثرت رائے کے سپرد نہیں کیا۔ بلکہ قوتِ رائے کا لحاظ کرتے ہوئے امیر مجلس کو اختیار دیا ہے کہ بجائے اکثریت کے اقلیت کو ترجیح دیدے۔ ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی انشاء اللہ تعالےٰ حل ہوجائے گا۔ کہ اسلامی خلافت ملوکیت وشخصیت کی شان رکھتی ہے یا جمہوریت کی، پھر چونکہ یہ مسئلہ خود ایک مستقل بحث ہے۔ جو مدت سے ملک میں چھڑی ہوئی ہے اس لئے ہم اس گذارش کو اسی عنوان کے ماتحت پیش کرتے ہیں۔ واللہ الموفق للصواب والمیسر للصعاب۔

اسلامی خلافت ملوکیت ہے یا جمہوریت

اسلام جس توسط واعتدال کو اپنے ساتھ لایا ہے اوس کے آثار تمام اسلامی

احکام۔ اعتقادات، عبادات، اخلاق، معاملات، سیاسیات و معاشرتیات میں نمایاں طور پر مشاہد ہیں۔ اور یہی اعتدال اس اُمت اُمیہ کا طغرائے امتیاز ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ"	اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط اُمت بنائی ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

مکہ معظمہ کی زاہدانہ زندگی کے بعد جب اسلام تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے اپنی سیاست اور تدبیر ممالک میں بھی اُسی اعتدال اور توسط سے کام لیا۔

اور ملوکیت و جمہوریت کے افراط و تفریط کو اٹھا کر سلطنت و سیاست کا ایک ایسا محکم قانون تیار کیا جو تمام مفاسد سے پاک اور تدبیر ممالک کی تمام ضروریات کے لئے صحیح معنوں میں کفیل ہے۔

ملوکیت اور شخصیت کے مفاسد

تو محتاج بیان نہیں۔ کیوں کہ مروجہ ملوکیت کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) تمام ملک ایک شخص کا غلام بلکہ غلاموں سے زیادہ پابند ہو۔

(۲) یہ شخص ظلم کرے یا انصاف کسی کو اس کے خلاف لب کھولنے کا حق نہ ہو۔

(۳) عہدہ سلطنت اس کی نسل میں متوارث ہو باپ کے مرنے کے بعد سارا ملک بیٹے کے قبضہ میں آجائے خواہ یہ کیسا ہی جاہل بدخلق اور نااہل نالائق ہو۔

(۴) تمام ملک کے جان و مال اُس کی ایک جنبش لب سے زیر و زبر ہو سکتے ہوں۔

الغرض شخصیت کا قانون محض بادشاہ کی زبان ہے۔ اور تمام خلق اللہ کی

موت وحیات محض اس کے رحم پر موقوف ہے۔ ساری مخلوق اس کی ذاتی خواہشات کی تختہ مشق ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت سے نظامِ سلطنت کیا قائم رہ سکتا ہے۔ اور لوگوں کے حقوق کیا ادا ہو سکتے ہیں۔

جمہوریت کے مفاسد آج کل کی مصطلحہ اور مروّجہ جمہوریت میں اگرچہ وہ مفاسد نہیں جو ملوکیت میں بیان کیے گئے لیکن اس میں بعض دوسرے ایسے مفاسد موجود ہیں جو نظام عالم کے قطعاً خلاف ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہی ہے کہ جمہوریت میں امیر و بادشاہ کی حقیقت ایک شطرنج کے بادشاہ سے زائد نہیں صرف اتنی عنایت اس کے حال پر کی جاتی ہے کہ اس کی رائے کو دورائے کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ اور بس حالانکہ عالم کا فطری نظام اول سے آخر تک اُسی کا مقتضی ہے کہ نظام سلطنت کا ذمہ دار کوئی ایک بااختیار شخص ہونا چاہیئے جس کو حقیقی طور پر امیر اور حاکم کہا جا سکے۔ اور جو امور سلطنت کے حل وعقد کا مالک ہو۔ اور جس کی اطاعت تمام رعایا پر فرض ہو۔

(۲) دوسرے ممبران جمہوریت کے باہمی اختلاف رائے کیوقت جمہوریت کا فیصلہ کثرت رائے کے تابع ہوتا ہے۔ کثرت رائے کے مقابلہ میں نہ امیر کی کوئی ہستی ہے اور نہ دوسرے اہلِ رائے اور تجربہ کار لوگوں کی۔

اور یہ ایک ایسی اصولی غلطی ہے جو سیکڑوں غلطیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج ہمارے یہاں کونسلوں اور بورڈ کے الیکشن میں جو طوفان بے تمیزی

کے منظر سامنے آتے ہیں اور کثرتِ رائے کے فیصلوں کے جو ناگوار نتائج ہمیں روزمرہ بھگتنے پڑتے ہیں ان کے مفاسد سے شاید کوئی انسان آنکھ نہ چرا سکے۔ آٹھ آنہ میں رائے بکتی ہے۔ ہر فریق کثرتِ رائے حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز ہتیار کام میں لاتا ہے۔ تعلقات کے دباؤ زور و زر کی نمائشوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔ اور بالآخر نتیجہ اس شخص کے ہاتھ ہوتا ہے جس کی گرہ میں روپیہ زیادہ ہو اور جو رسوموں میں بے دریغ خرچ کرنے کا عادی ہو۔ یا جس کے تعلقات سے یا زور سے لوگ مرعوب ہوں یہ ایک ایسی بداہت ہے کہ جس کا ہر شخص سالانہ مشاہدہ کرتا ہے اور پھر یہ طوفان بے تمیزی اپنی برکات جو ملک میں چھوڑ جاتا ہے وہ سب سے زیادہ قابلِ غور ہیں، الیکشن کا فتنہ تو چند روز میں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن باہمی خانہ جنگیاں۔ عداوتیں اور بغض و عناد جو اس وقت قلوب میں قائم ہو جاتی ہے وہ اکثر ایسا صدقہ جاریہ ہوتا ہے جو قبروں میں ساتھ جاتا ہے

اس سال کونسل کے الیکشن کے زمانہ میں ایک مقتدر باپ اور بیٹے کی جنگ جب اخباری دنیا میں منظرِ عام پر آئی تو جس طرح باپ کو بیٹے کے شرمناک عیوب اخبارات و اشتہارات میں شائع کرنے سے دریغ نہ تھا ہونہار فرزند کو بھی ہم اس میدان کارزار میں باپ سے کسی طرح کم نہ پاتے تھے۔ بلکہ ہر گالی کا جواب اس سے زیادہ وزن کی گالی سے دیا جاتا تھا۔

خیر یہ تو اُس حریت کا نتیجہ تھا جو یورپین تمدن کا لازمی اثر ہے اور جس کا خلاصہ نہ فقط مذہب سے آزادی بلکہ انسانیت کی ہر پابندی سے آزادی ہے۔

الغرض یہ سب اس جمہوریت اور کثرتِ رائے کے فیصلوں کی برکت

ہے جس کو آج سیاست کا اساسی قانون بنا لیا گیا ہے۔

موجودہ اور مروجہ جمہوریت کے فیصلوں پر اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو جمہوری حکومت کا خود سرامیر یا روپیہ نکلتا ہے اور یا جبر و استبداد اور مکر و فریب کیونکہ جب کثرت رائے کا پردہ فاش ہوتا ہے تو اس کے پس پردہ یہی چیزیں کارفرما نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ الیکشن کے تمام انتخابات میں عموماً وہ خود غرض۔ ہوا پرست نااہل لوگ۔ خلق اللہ کی جان و مال کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ جن کی نیت اور ہمت ابتدا ہی سے اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ہمیں حکومت کی کرسی مل جائے۔ پھر مخلوق آرام سے رہے یا تباہ ہو۔ چنانچہ ان کی رائے زنی کا حاصل بھی اس سے زائد نہیں ہوتا کہ جس طرف زیادہ ہاتھ اُٹھتے نظر آئے انھوں نے بھی اپنی جھنڈی اُسی طرف کے لئے اٹھا دی۔ اکثر انھیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کس معاملہ کے متعلق ہم سے رائے لی گئی ہے۔

اور ان تمام فتنوں کے طوفان کی ذمہ داری صرف کثرت رائے کے فیصلوں پر ہے اگر اختلاف رائے کے وقت فیصلہ امیر مجلس کے سپرد ہو تو ان میں سے اکثر مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

الغرض جس طرح شخصیت محض بادشاہ پرستی کا نام ہے اور نظام عالم کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ اسی طرح آج کل کی مصطلحہ جمہوریت اسکے بالکل خلاف ایک غوغائے ناس کا نام ہے جس کے مفاسد بھی شخصیت سے کم نہیں۔

اسلام جو نظام عالم کا حقیقی ذمہ دار ہے اس کا فرض تھا کہ اس افراط و

تفریط کے درمیان ایسا راستہ اختیار کرے جو ہر قسم کے مفاسد اور خطرات سے پاک ہو۔

چنانچہ اسلامی حکومت کی بنیاد ایک ایسے قانون پر رکھی گئی جو بعض اعتبارات سے شخصیت سے ملتا ہے اور بعض وجوہ سے جمہوریت کا ہمرنگ ہے۔

یعنی خذ ما صفا ودع ما کدر (جو بات اچھی ہو اس کو اختیار کرلو اور جو بُری ہو چھوڑ دو) کے قانون پر عمل کرتے ہوئے شخصیت و جمہوریت دونوں کی وہ دفعات جو مفاسد پر مشتمل ہیں اسلام نے ان سب کو نظر انداز کر دیا اور جن دفعات کے ماتحت نظام عالم درست ہو سکے ان کو اختیار کر لیا۔ جس کی اجمالی صورت یہ ہے۔

(۱) اسلامی خلافت میں وراثت نہیں چلتی۔ یہ ضروری نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا یا اسی کی نسل کا کوئی اور آدمی خلافت و امارت کا جاگیردار ہو۔ بلکہ بیعت عامہ یا مشورہ سے انتخاب ہو جائے اور یا سابق خلیفہ کسی شخص کو اپنی رائے سے مقرر کر دے (وہ ہی اس عہدہ پر فائز ہوگا۔ (ازالۃ الخفاء) حضرت فاروق اعظم رضؓ اسی دفعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لاخلافۃ الاعن مشورۃ | کوئی خلافت بغیر مشورہ کے نہیں ہو سکتی۔

(کنز العمال ص ۱۳۹ ج ۳)

(۲) مہم معاملات میں تنہا خلیفہ بغیر مشورہ کے طے نہیں کر سکتا۔ آیۃ کریمہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اور معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیجئے) میں خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ کا حکم فرما کر اُمت کے لئے اُسوہ

بنا دیا گیا ہے۔

(۳) اگر خلیفہ وقت کوئی خلافِ شرع فعل اختیار کرے تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو حق ہے کہ امر بالمعروف کے قواعد و آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ناصحانہ طور پر کلمہ حق اس کے سامنے پیش کردے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ازالۃ الخفاء میں اس کے متعلق فرماتے ہیں" وازاعظم انواع جہاد است امر کردن خلیفہ بمعروف و نہی او از منکر بغیر خروج بسیف و می باید کہ بلطف باشد دون العنف و در خلوت باشد دون الجلوۃ تا فتنہ بر نخیزد" خلفاء راشدین اور صحابہ کے بہت سے واقعات اس کے شاہد عدل ہیں۔

(۴) خلیفہ وقت اگر کسیکو صریح خلاف شرع کام کرنے کا حکم دے تو اُس پر اس کام میں خلیفہ کا اتباع واجب نہیں۔ حدیث میں اسی دفعہ کے متعلق ارشاد ہے۔

لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق } خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

(۵) امیر اگر اسلام کو ترک کر کے مرتد ہو جائے تو وہ امارت سے معزول ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں پر اس سے جہاد کرنا فرض ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی امیر عام طور پر بے دریغ قتل و غارت اور عورتوں کی عفت دری اور غصب مال کرنے لگے اور شریعت کے قانون کا کوئی لحاظ نہ رکھے تب بھی جائز ہے کہ مسلمان اس کے خلاف جمع ہو کر اُسے معزول کر دیں۔ کیونکہ اس کا حکم ڈاکوؤں کا سا حکم ہے (ازالۃ الخفاء) لیکن جب تک یہ نوبت نہ آئے بلکہ شخصی طور پر کسی کسی پر ظلم کرے اس وقت تک اس کی بغاوت ہرگز

جائز نہیں۔ بلکہ اس کی اطاعت پر صبر کرنا فرض ہے جس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

یہ چند اصولی دفعات ہیں جو جمہوریت سے ملتی جلتی ہیں شخصی سلطنت میں یہ صورتیں موجود نہیں ہوتیں۔

اور دفعاتِ ذیل شخصیت کی ہمرنگ ہیں۔

(۶) مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرتِ رائے کے سپرد نہیں۔ بلکہ امیر کی رائے پر ہے اور اس کو اختیار ہے کہ اقلیت کو اکثریت پر ترجیح دیدے۔ قرآن عزیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم فرمانے کے بعد فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (پھر جب آپ عزم کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کریں) بصیغہ واحد حاضر فرما کر اُس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد کسی جانب کو ترجیح دیکر اس کا عزم کرنا یہ فقط آپ کی رائے پر ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دوسرے خلفاء کے بہت سے معاملات اس کے شاہد ہیں جن کو انشاء اللہ تعالےٰ بتفصیل عرض کیا جائے گا۔

(۷) امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے ذمہ سرًّا و علانیۃً فرض ہے۔ جب تک کہ وہ کسی صریح حرام کا حکم نہ کرے۔ قرآن عزیز میں اسی کے متعلق ارشاد ہے

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم	اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو۔

(۸) امیر اگر کوئی ظالمانہ حکم نافذ کرے تب بھی رعایا کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ ان کو اس وقت صرف اتنا حق ہے کہ امر بالمعروف کے ذریعہ

حق بات اس کے سامنے پیش کر دیں اور بس لیکن اگر امر بالمعروف کے بعد بھی امیر اپنے اس حکم پر قائم رہے تو رعایا کا فرض ہے کہ صبر کے ساتھ اس کی اطاعت کرے۔ اس کی سرکشی اور بغاوت کے لئے آمادہ ہونا اُس وقت بھی جائز نہیں حدیث میں اس دفعہ کے متعلق بکثرت تصریحات موجود ہیں۔

حضرت جریر ابن عبداللہؓ روایت فرماتے ہیں کہ چند گاؤں والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ بعض صدقات[1] زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ظلم کرتے ہیں (یعنی مقدارِ واجب سے زیادہ ہم سے وصول کرتے ہیں) آپ نے ارشاد فرمایا:

ارضوا مصدقیکم (ابوداؤد) } اپنے عامل صدقہ کو راضی کرو۔

انھوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تب بھی ہم اُن کو راضی کریں آپ نے ارشاد فرمایا۔

ارضوا مصدقیکم وان ظلمتم (رواہ ابوداؤد از مشکوٰۃ) } اپنے عاملین صدقہ کو راضی کرو اگرچہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یہ عاملین صدقہ چونکہ خلیفہ اور امیر وقت کے نائب ہو کر ان لوگوں کے

---

[1] اموال ظاہرہ یعنی مال تجارت اور جانوروں کی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے خلیفہ وقت کی طرف سے کچھ لوگ ملازم ہوتے تھے جو تمام صدقات وصول کر کے خلیفہ کے پاس جمع کرتے تھے اور پھر خلیفہ ان کو مصرف زکوٰۃ میں اپنے انتظام سے خرچ کرتا تھا۔ ان لوگوں کو عامل صدقہ کہا جاتا تھا جو امیر وقت کے نائب ہو کر صاحب نصاب لوگوں کے پاس جاتے تھے ۱۲ منہ

پاس جاتے تھے اس لئے ان کو مجبور کیا گیا ہے کہ ہر حال میں ان کی اطاعت کریں۔ وہ ظلم کریں تب بھی ان کے ذمہ ان کی اطاعت ضروری ہے۔

اسی کے متعلق ایک دوسری حدیث میں حضرت جابر ابن عتیک راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

سیاتیکم رکیب مبغضون فاذا جاؤکم فرحبوا بھم وخلوا بینھم وبین ما یبتغون فان عدلوا فلانفسھم وان ظلموا فعلیھم وارضوھم فان تمام زکوتکم رضاھم ولیدعوا لکم

(رواہ ابوداؤد (از مشکوٰۃ)

قریب ہے کہ تمہارے پاس چند مبغوض لوگ آئینگے پس جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم انکی ساتھ فراخدلی سے پیش آؤ اور جو کچھ وہ طلب کریں انکو دیدو۔ اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کو اس کا فائدہ پہنچیگا اور اگر انھوں نے ظلم کیا تو اس کا ضرر بھی وہ بھگتیں گے تم انکو راضی کرو اس لئے کہ تمہاری زکوٰۃ کا اتمام ان کی رضا پر موقوف ہے (اور تم انکی ساتھ اس طرح پیش آؤ) کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔

ان احادیث سے بصراحت معلوم ہوا کہ امیر وقت اگر ظلم بھی کرے تب بھی رعیت کے لئے اطاعت کے سوا کسی حربہ کا استعمال جائز نہیں جبتک کہ اس کا ظلم وجور اور بددیانتی عام خلق اللہ کو محیط ہو کر اس درجہ کو نہ پہنچ جائے کہ اس کو ڈاکوؤں کی فہرست میں داخل سمجھا جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ

لیکن یہ مطلب اس کا ہرگز نہ سمجھا جائے کہ اسلام نے خلیفہ اور امیر وقت کے لئے ظلم کا میدان وسیع کر کے امراء کو ظلم کرنے پر جری اور بیچاری رعیت کو ظلم سہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور یہ وہ ہی عجمی ملوکیت و شخصیت ہے جس کے مفاسد اوپر بیان کئے گئے ہیں۔

کیونکہ نظام معاملات کی درستی کے لئے اسلام کا ایک خاص حکیمانہ اصول ہے جس کے تمام پہلو دیکھنے کے بعد ہر فہیم انسان یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ لوگوں کے باہمی معاملات کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں ہوسکتا

اسلام نے ایک طرف اگر رعایا کو اس پر مجبور کیا ہے کہ امیر وقت کے ظلم و ستم کے وقت بھی تم اس کو راضی کرنے کی کوشش کرو اور ہر حال میں اس کی اطاعت تمہارا فرض ہے۔ تو دوسری جانب امراء کو بھی آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کو اپنی جگہ میں اتنا پابند بنایا ہے کہ اُن کی کوئی حرکت و سکون عدل کے خلاف نہ ہو سکے۔

حضرت معاذؓ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والیٔ یمن بنا کر رخصت کیا ہے۔ تو مفصل وصیتوں کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے۔

ایاك وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب۔ (رواه البخاری ومسلم۔ مشکوٰۃ)	زکوٰۃ میں لوگوں کے عمدہ عمدہ مال منتخب کرنے سے بچو۔ اور مظلوم کی بد دعا سے ڈرو۔ کیونکہ اس کے اور خدا تعالےٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔

نیز حضرت جابر ابن عتیک والی حدیث میں جس جگہ رعایا کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں امیر کی اطاعت کریں۔ وہیں ان امراء کو جو لوگوں پر ظلم کریں۔ مبغوض و مردود فرمایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سیکڑوں احادیث ہیں جن میں ذرا سے ظلم کرنے والے امیر کے لئے ایسی سخت سخت وعیدیں فرمائی گئی ہیں۔ کہ انکو سنکر پتہ پانی ہوتا ہے۔

الغرض ادھر امیر کو اپنی جگہ میں ظلم کے پاس جانے سے روک دیا گیا۔ اور ادھر

رعایا کو اسپر مجبور کیا گیا کہ اگر وہ اپنے فرائض کو چھوڑ کر ظلم کرنے پر اُتر آئیں تمہیں اس وقت بھی اپنے فرائض اطاعت کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اسلام نے بیشتر تدبیر منزل و تدبیر ملک وغیرہ میں اسی زریں اُصول سے کام لیا ہے، باپ بیٹے کے معاملات میں ایک طرف بیٹے کو مجبور کیا کہ اگر باپ ظلم کرے تب بھی اُس کی اطاعت تمہارے ذمہ فرض ہے۔ اور دوسری طرف باپ کو حکم کیا کہ اپنی اولاد کے ساتھ شفقت و رحمت سے کام لے اور جو ایسا نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ اسی طرح خاوند بیوی کے معاملات میں بیوی کو مجبور کیا کہ خاوند اگر ظلم بھی کرے۔ تب بھی تم اُس کی اطاعت نہ چھوڑو، اُدھر خاوند کو سخت تاکید کی کہ بیوی کے حقوق کی پوری نگرانی کرے، اور اگر اس میں کوتاہی کی تو قیامت میں اُس کی جزا کے لئے تیار ہو جائے اور یہ ایک ایسا حکیمانہ اُصول ہے کہ جس سے تمام باہمی نزاع کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اختلافات اور جھگڑوں کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی حدود اور اپنے فرائض کو چھوڑ کر دوسرے کی حدود میں گھسنا چاہتا ہے۔

مثلاً معاملات میں عدل و انصاف کرنا امیر کا فرض منصبی ہے۔ مامور رعایا کو اس میں اس سے زیادہ مداخلت جائز نہیں کہ آداب امر بالمعروف کو لحاظ رکھتے ہوئے حق بات امیر تک پہنچا دے۔ امیر اگر اپنے فرض کو ترک کرے تو کسی طرح عقل کا مقتضا نہیں کہ مامور بھی اپنی حدود سے باہر نکل کھڑا ہو اور اپنے فرائض کو چھوڑ دے۔

کیونکہ یہ انتقامی جذبہ کسی طرح مامور کے حق میں مفید نہیں اور نہ اُسکے ذریعہ سے وہ اپنے حقوق امیر سے وصول کر سکتا ہے۔

فرض کرو کہ اگر اسلام اس وقت مظلوم کو ترک اطاعت کی اجازت دیدے اور اُس کو بغاوت و سرکشی سے نہ روکے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ اگر یہ مظلوم کوئی قوت و شوکت نہیں رکھتا تو بغاوت کر کے پہلے سے زیادہ مصائب و مظالم میں گرفتار ہو جائے گا اور اگر اُسنے کوئی قوت و شوکت حاصل کرلی جس کے ذریعہ سے امیر کے مقابلہ پر آ سکے تو یہ فتنۂ عظیم ہوگا جس میں سارے ملک کی جانیں اور مال خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ اور جانبین کی بہت سی جانیں اور مال ضائع ہوں گے۔

بغاوت سے پہلے اگر صرف ایک شخص کا نقصان تھا تو بغاوت کرنے میں سارے ملک کا اُس سے سو گنا زائد نقصان ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر سارا ملک عام طور پر اُس کے مظالم کا شکار ہو جائے اور قتل و غارت میں اسے کسی شرعی حکم کا لحاظ نہ رہے تو پھر اس کے خلاف کرنے اور اُس سے بدلہ لینے کو اسلام نے بھی جائز رکھا ہے۔ کما مر

ان نتائج پر نظر کرتے ہوئے اسلام نے حکمت کے مشہور قانون پر عمل کیا کہ:

اذا ابتلی المرء ببلیتین فلیختر	جب آدمی دو بلاؤں میں گرفتار ہو تو دونوں
اھونھما۔	میں سے جو سہل ہو اسکو اختیار کر لینا چاہیئے۔

جب امیر وقت ظلم کرے تو ہمارے سامنے دو مصیبتیں ہیں ایک یہ کہ مظلوم اپنے ظلم پر صبر کرے۔ اور دوسرے یہ کہ علم بغاوت بلند کر کے خود بھی اس سے زیادہ

مصیبت میں گرفتار ہو اور دوسروں کو بھی بلا میں مبتلا کرے۔ ظاہر ہے ان دونوں مصیبتوں کے مقابلے کے وقت پہلی شکل کا اختیار کرنا ہی عقلِ سلیم کا مقتضیٰ ہوگا۔ اور میں کہتا ہوں کہ ایسی حالت میں مظلوم کو ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کا ذمہ دار فقط شخصیت یا اسلام نہیں۔ آج اگر موجودہ جمہوریتوں میں کسی شخص پر ظلم ہو اور کثرتِ رائے اُس کے خلاف فیصلہ کر دے تو بتلایئے کہ یہ شخص کیا کرے گا اور اُس وقت سیاسی مدبرین اس کے لئے کیا فتویٰ دیں گے۔

کیا کسی عاقل کے نزدیک اُس کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ جمہوریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے خود بھی پہلے سے زیادہ مصائب کا تختۂ مشق بنے اور دوسرے لوگوں کو بھی مصیبت میں ڈالدے۔

بلکہ ہر عقلمند ایسی حالت میں اسکو صبر کی تلقین کے سوا کوئی چارہ کار نہ سمجھے گا۔ لیکن اس تلقین صبر کا کسی کے نزدیک یہ مطلب نہ ہوگا کہ وہ جمہوریت کے ظلم کا حامی ہے یا امرار کے لئے ظلم کا میدان وسیع کر رہا ہے۔

پس اگر اسلام نے ایسی حالت میں مظلوم کو اطاعت امیر پر مجبور کیا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے ظلم کا دروازہ امرار کے لئے کھولدیا۔ خصوصاً جبکہ دوسری جانب امرار کو بھی اتنا کس دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے اور ادھر رعایا کے ہر فرد کو یہ حق دیا ہے کہ امر بالمعروف کے ذریعہ سے کلمۂ حق اُسکو پہنچادے اور اُس کو اپنے فرائض یاد دلائے۔

الغرض اسلامی قانون سیاست کی آٹھویں اصولی دفعہ یہ ہے کہ اگر خلیفہ وقت ظلم بھی کرے تب بھی رعایا پر اُس کی اطاعت فرض ہے۔ البتہ امر بالمعروف کرنے کا حق ہر شخص کو ہر وقت حاصل ہے۔

(۹) انتخاب امیر کے وقت ضروری ہے کہ خلافت و امارت کی شرطوں پر نظر رکھی جائے جنمیں سے عدالت بھی ایک شرط ہے۔ اس لئے کسی فاسق کو اپنے اختیار سے خلیفہ بنانا جائز نہیں۔ لیکن اگر کوئی فاسق زبردستی سلطنت پر قابو پالے یا پہلے بوقت انتخاب فاسق نہ تھا بعد میں فاسق ہوگیا۔ تو باوجود اُس کے فسق کے اُس وقت تک اس کے خلاف علم بلند نہ کیا جائیگا جب تک کہ کفر صریح میں مبتلا نہ ہو جائے۔ (ازالۃ الخفا حضرت شاہ ولی اللہؒ) البتہ اگر کفر صریح میں مبتلا ہو جائے تو وہ خلافت سے معزول ہے اور مسلمانوں کو اُس کا علیحدہ کرنا ضروری ہے۔

(۱۰) مسائل مجتہد فیہا جن میں جانبین میں ادلۂ شرعیہ موجود ہیں جیسے حنفی شافعی وغیرہ کے مختلف فیہ مسائل ان میں سے اگر امیر کسی ایک جانب کو متعین کرکے لوگوں کو اسپر عمل کرنے کا حکم دے تو اُن کا فرض ہوگا اُسکا اتباع کریں اگرچہ بحیثیت حنفیت یا شافعیت وہ اس کے مذہب کے خلاف ہو۔

(۱۱) ارکان مجلس شوریٰ کا انتخاب بھی اسلامی سیاست میں اس طوفان بے تمیزی کے ساتھ نہیں ہوتا جو موجودہ جمہوریت کا طغرائے امتیاز ہے اور جس کی بدولت تمام ملک جنگ وجدل بغض وعناد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بلکہ یہ انتخاب عموماً امیر خود اپنی رائے سے کرتا ہے۔ یہ چند دفعات ہیں جو شخصیت کے ہمرنگ نظر آتی ہیں۔

مجھے اس وقت اسلام کا سیاسی قانون پیش کرنا نہیں۔ بلکہ صرف یہ دکھلانا مقصود تھا کہ اسلامی سیاست نہ درحقیقت وہ شخصیت وملوکیت ہے جو کسریٰ وقیصر اور ملوک عجم کا طریق تھا۔ اور نہ وہ جمہوریت جس کا آج کل عالم میں دور دورہ ہے

کیونکہ یہ دونوں طریق نظام عالم کی اصلاح کیلئے کافی نہیں۔ بلکہ اسلام نے اپنے اساسی اصولِ اعتدال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک صراطِ مستقیم اختیار کیا ہے جو نظام عالم اور معاملات خلق کی اصلاح کے لئے بہترین کفیل ہے۔ اور اس تمام بحث میں بھی اصل غرض صرف اس جزو سے متعلق تھی کہ مشورہ میں اگر اختلاف رائے پیش آئے تو فیصلہ کثرت رائے کے سپرد نہیں بلکہ امام کی رائے پر موقوف ہے۔ جس کو اجمالاً دفعہ (۶) میں عرض کیا گیا ہے۔ اس وقت ہم اس کو کسیقدر تفصیل سے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے پر ہے یا امیرِ مجلس کی رائے پر

اصولی طور پر اس بحث میں بھی ہمیں سب سے پہلے قرآنِ عزیز کو حکم بنانا چاہیئے اور اُسی کے فیصلہ کو محکم اور مختتم فیصلہ سمجھنا چاہیئے جس کی چند آیات اس وقت درجِ ذیل کی جاتی ہیں۔

مشورہ کے متعلق قرآنِ عزیز کی سب سے زیادہ مشہور آیت یہ ہے:۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ؛	آپ (معاملات میں) صحابہ اور عام مسلمانوں سے مشورہ لیجئے اور جب پختہ ارادہ کریں تو اللہ تعالےٰ پر توکل کیجئے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو حکم فرمایا گیا ہے کہ اہم معاملات میں (جنمیں صریح وحی نہ آئی ہو) صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مشورہ کے بعد جب آپ کسی ایک جانب کا

عزم فرمائیں تو اُس میں اللہ تعالےٰ پر اعتماد کریں اپنی رائے یا مشورہ پر بھروسہ نہ کریں جس سے صاف معلوم ہوا کہ مشورہ کے بعد کسی ایک جانب کو ترجیح دینا اور اس کا عزم کرنا یہ فقط امیرِ مجلس کی رائے پر موقوف ہے۔ اور اگر مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے کے سپرد ہوتا تو مناسب تھا کہ عزم کے لئے بھی جمع کا صیغہ استعمال کر کے یوں فرمایا جاتا فاذا عزموا (یعنی جب صحابہ کسی جانب کا عزم کریں)

الغرض آیت میں بجائے صیغہ جمع کے مفرد کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کو بھی صاف کر دیا گیا ہے۔ کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کی صورت امیر مجلس کی رائے پر چھوڑی امیر اپنی دیانت اور فہم سے جس رائے کو زیادہ صائب سمجھے اس کو نافذ کر دے۔

مشورہ کے متعلق دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ پ۲۵)	یعنی مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔

جس میں صحابہ کرام اور سچے مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کا اجمالی نقشہ دکھلاتے ہوئے اُن کے اس طرزِ عمل کی مدح کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں خود رائی سے کام نہیں لیتے بلکہ مشورہ کر کے طے کرتے ہیں۔

اس میں اگرچہ مسئلہ زیر بحث یعنی درصورت اختلاف فیصلہ مشورہ کے متعلق صراحۃً کوئی حکم مذکور نہیں لیکن جن حضرات کے مشوروں کی اس آیت میں مدح فرمائی گئی ہے جب ہم اُن کے تعامل پر نظر ڈالتے ہیں تو بلاشائبہ اختلاف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مجلس شوریٰ پر کثرت رائے کی حکومت نہ تھی۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے مشاورات جنکا ایک حصہ انشاء اللہ تعالےٰ آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان میں سے کسی ایک میں آپ

نہ دیکھیں گے کہ مشورہ کے بعد موجودہ طرز پر ووٹ لئے گئے ہوں اور آراء کو شمار کر کے ان کی کثرت پر فیصلہ کیا گیا ہو آیات فرقانیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال اور پھر تعامل صحابہ کا درجہ ہے۔ جو درحقیقت آیات قرآنی ہی کی صحیح تفسیر اور واضح شرح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاورات اور فیصلہ کی صورت

غزوہ بدر مسلمانوں کی شاندار فتح پر ختم ہوا اور قریش کے بڑے بڑے ستر آدمی گرفتار ہو کر دربار نبوت میں حاضر کئے گئے۔ تو یہ سوال پیش ہوا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حسب عادت اس کے لئے مجلس شوریٰ طلب کی اور صحابہ کو جمع کر کے مسئلہ زیر بحث پیش فرمایا۔ اتنی بات پر تمام روایات حدیث متفق ہیں کہ اس بارہ میں صحابہ کرام کی جانب سے مختلف رائیں پیش کی گئیں۔ اور صدر الصدور سید الاوّلین والآخرین نے ایک جانب کو ترجیح دیکر حکم نافذ فرمایا۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اگر اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان کی صحیح تعداد اور انکی رائیں معلوم ہو جائیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اختلاف کو کس طرح رفع فرمایا۔ کثرت رائے کا اعتبار کیا یا قوت کا اور اکثریت کو ترجیح دی یا اقلیت کو تو ہماری بحث کا اسی پر خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن یہ عجب اتفاق ہے کہ اس مشہور واقعہ کو بہت سے راوی روایت فرماتے ہیں۔ مگر صحیح طور پر اس کی کوئی خبر نہیں دیتا کہ اس جلسہ شوریٰ کے شرکاء کتنے حضرات تھے اور انھوں نے کیا کیا رائیں پیش فرمائیں بلکہ عام طور پر صرف حضرت صدیق اور فاروق اعظم کا اختلاف رائے

ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ کتب حدیث و تفسیر اور سیر کی بہت سی ورق گردانی کے بعد چند حضرات کے اسمار گرامی اور انکی رائیں اور وہ تقریریں جو انھوں نے اس مجلس میں کیں ہیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ جس سے مسئلہ زیر بحث کا علی وجہ البصیرت فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

روایاتِ حدیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجلس شوریٰ ایک معتدبہ جماعت پر مشتمل تھی جنمیں سے حضرات ذیل کے اسمار گرامی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں: حضرت صدیق اکبرؓ[1] حضرت عمر فاروق اعظمؓ[2] حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ حضرت سعد ابنِ معاذؓ۔

ان حضرات میں سے صرف حضرت صدیق اکبرؓ کی یہ رائے تھی کہ ان سب کو چھوڑ دیا جائے۔ باقی حضرات میں سے کسی نے انکی تائید نہیں کی۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تو یہ تقریر فرمائی:

"یارسول اللہؐ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کو وطن سے نکالا۔ اور آپکے ساتھ قتل و قتال کیا۔ میری رائے ہیں تو اُن کو بُلا کر سب کی گردن ماردی جائے (ترمذی ابن ابی شیبہ امام احمد عن عبداللہ ابن مسعود از در منثور صفحہ ۲۰۱)"

حضرت[2] عبداللہ ابن رواحہؓ نے اس سے زیادہ غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا:۔

"یارسول اللہؐ میری رائے تو یہ ہے کہ ان سب کو کسی ایسی وادی میں داخل کیا جائے جہاں سوختہ زیادہ ہو۔ اور پھر اس میں آگ لگادی جائے (روایت مذکورہ)"

حضرت[3] سعد ابنِ معاذؓ سے کوئی خاص تقریر منقول نہیں مگر ابن جریر نے بروایت

محمد ابن اسحٰق اتنا نقل فرمایا ہے کہ اُن کی رائے بھی یہی تھی، سب کو قتل کر دیا جائے (تفسیر روح المعانی صفحہ ۲۶ ج ۲۶)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شرکت جلسہ کو خود حضرت عمر نے ذکر فرمایا ہے۔[1] مگر اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا کہ اُن کی رائے کس طرف تھی۔

بہرحال جن حضرات کے اسمار گرامی مذکور ہیں اُن میں سے صرف ایک صدیق اکبرؓ کی یہ رائے منقول ہے کہ ان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے باقی کسی کی تائید منقول نہیں۔

البتہ حضرت عبداللہ ابن عمر کی ایک روایت میں اجمالاً اسقدر منقول ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی مختلف رائیں مجلس میں پیش ہوئیں تو بعض حضرات نے ان کی موافقت کی اور بعض نے ان کی (اخرجہ ابن المنذر وابو الشیخ وابن مردویہ کذا فی الدر صفحہ ۲۰۲ ج ۳)

لیکن اس روایت میں نام کسی کا نہیں لیا گیا۔ بہرحال جن حضرات کے ناموں کی صراحت ملتی ہے ان میں صرف ایک رائے چھوڑ دینے کی طرف ہے اور باقی اُن سے بدلہ لینے اور قتل کرنے کی طرف۔

یہاں تک تو شوریٰ کی رائیوں کا تذکرہ تھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس مجلس کے امیر حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ کس طرح فرمایا۔

اس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ والی حدیث میں مذکور ہے۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ارار مختلفہ سنکر گھر میں تشریف لے گئے اور کسی کو کچھ جواب نہیں دیا۔ ادھر صحابہ میں رائے زنی شروع ہوئی کوئی کہتا تھا کہ آپ حضرت صدیق کی رائے کو اختیار فرمائیں گے

[1] اخرجہ ابن ابی شیبہ واحمد ومسلم وابوداؤد والترمذی وغیرہم کذا فی الکنز صفحہ ۲۶۵ ج ۵

اور کسی کا خیال تھا حضرت فاروق کی رائے قبول کی جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد آپ باہر تشریف لائے اور ایک مختصر تقریر فرمائی (یہ تقریر حدیث عبداللہ ابن مسعود میں مفصل مذکور ہے) جس میں فریقین کی دلجوئی کے الفاظ تھے اور پھر آپ نے آخری فیصلہ حضرت صدیق رضؓ کی رائے پر فرمایا (رواہ احمد والترمذی وحسنہ الطبرانی والحاکم وصححہ کذا فی روح المعانی صفحہ ۲۶۰ جلد ۲)

خود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اس واقعہ کی روایت کی تو فیصلہ کے متعلق یہ الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

فھوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما قال ابوبکر ولم یھو ما قلت و اخذ منھم الفداء (رواہ ابن ابی شیبہ واحمد ومسلم وابو داؤد والترمذی وغیرہم عن ابن عباس عن عمر رضی اللہ عنہ) (کنز العمال صفحہ ۲۶۶ ج ۵)	پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے قول کو پسند فرمایا۔ اور میرے قول کو پسند نفرمایا۔ اور قیدیوں سے فدیہ لیکر چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صدیق اور فاروق اعظم کو خطاب کرکے فرمایا۔

لو اجتمعتما ما عصیتکما اخرجہ ابن مردویہ عن ابن عباس رضؓ (در منثور صفحہ ۲۰۲ ج ۳)	اگر تم دونوں ایک رائے پر جمع ہو جاتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے ان ارشادات نے ہمارے زیر بحث مسئلہ کا بچند وجوہ قطعی فیصلہ فرمایا ہے۔

(الف) شرکاء مجلس میں سے جن حضرات کی رائیں روایات میں مذکور ہیں ان میں اکثریت بلکہ ایک رائے کے سوا تمام رائیں اس طرف تھیں کہ ان قیدیوں سے انتقام لیا جائے اور قتل کر دیا جائے۔ صرف ایک صدیق اکبرؓ کی رائے تھی کہ فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اکثریت کی کچھ پرواہ نہ کی بلکہ قوت رائے پر اعتماد کرتے ہوئے حضرت صدیق کی رائے کو ترجیح دیدی۔

(ب) اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجائے تو فیصلہ کے متعلق جو الفاظ حضرت عمرؓ نے ذکر کئے ہیں وہ خود ہمارے لئے ایک مستقل دلیل ہیں۔ جن میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو پسند نہیں فرمایا۔ ان الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ درصورت اختلاف مشورہ کا فیصلہ امیر مجلس کی رائے پر ہے۔ اس کے نزدیک قوت رائے کے اعتبار سے جو پسندیدہ ہو اس کو نافذ کرے خواہ اکثریت اس کے موافق ہو یا مخالف۔

(ج) عام صحابہ کرامؓ نے جو فیصلہ کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے الفاظ بھی تقریباً حضرت فاروقؓ کے بیان کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ جن میں ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ کوئی کہتا تھا کہ آپ حضرت صدیق کی رائے کو قبول فرمائیں گے اور کسی کا خیال تھا کہ اس بحث میں رائے فاروق کو ترجیح دیجائے گی۔ یہ کسی نے نہ کہا کہ مجلس کے موجودہ ارکان کو شمار کرکے کثرت رائے سے صورت فیصلہ کی تعیین کر لیتا یہ صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے مجالس مشورہ پر کثرتِ رائے کی حکومت

نہ تھی۔ ورنہ صحابہ کو اس رائے زنی کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا کیونکہ صورت فیصلہ خود بخود متعین تھی۔

(د) حضرت ابن عباسؓ کی روایت شیخین رضؓ کے متعلق خود حضرت نبوت کے یہ الفاظ ابھی نقل کئے گئے ہیں کہ "اگر تم دونوں کسی رائے پر متفق ہوتے تو میں تمہارا خلاف نہ کرتا" اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اختلاف آرا کی صورت میں آپ کثرت رائے کے پابند نہ ہوتے تھے۔ ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ میں تم دونوں کا خلاف نہ کرتا۔

اس ایک واقعہ نے اتنی متعدد وجوہ سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی سیاست میں کثرت کی بجائے قوتِ رائے کا اعتبار ہے۔ اور امیر مجلس کثرت رائے کا پابند نہیں کیا جاتا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں پر اگر یہ کہا جائے کہ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکثریت کے مقابلہ میں صرف حضرت ابوبکر کی رائے پر عمل فرمایا تھا۔ لیکن خداوند عالم کے نزدیک یہ فعل مقبول نہ ہوا بلکہ اظہار ناراضی کے کلمات قرآن کریم میں نازل ہوئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک اجتہادی لغزش تھی جس کا ہونا شانِ نبوت کے خلاف نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ناراضی کا سبب نہ کثرت رائے کو چھوڑنا ہے۔ اور نہ یہ کہ جس رائے کو اختیار کیا گیا ہے وہ فی نفسہ غلط تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں بھی حکم وہ ہی باقی رہا جو اس واقعہ میں حضرت صدیق کے رائے کے موافق جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ حدیبیہ میں ستر قیدیوں کو چھوڑا ہے۔ نیز ثمامہ

ابن اثال کو قید کرنے کے بعد رہا فرمایا ہے۔ بلکہ یہ ناراضی دوسرے اسباب کی بنا پر تھی۔ (جنکے بیان کا یہ موقع نہیں) یہی وجہ ہے کہ اظہار ناراضی کے الفاظ میں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ نے کثرت رائے کو چھوڑ کر اقلیت کو کیوں ترجیح دی۔ بلکہ دوسرے اسباب ذکر کئے گئے ہیں۔

حافظ ابن قیم رح زاد المعاد میں اس بحث کے متعلق لکھتے ہیں۔ وقد تکلم الناس فی ای الرأیین کان اصوب فرجحت طائفة قول عمر لهذا الحدیث ورجحت طائفة قول ابی بکر رض لاستقرار الامر علیه وموافقة الکتاب الذی سبق من الله باحلال ذلك لهم ولموافقته الرحمة التی غلبت الغضب (زاد المعاد ص ۳۲۳ ج ۱)

(ترجمہ) لوگوں نے اس میں کلام کیا ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کونسی رائے درست اور صواب تھی۔ سو بعض حضرات نے حضرت عمر کی رائے کو صواب قرار دیا ہے بوجہ اسی حدیث کے (جس میں خداوند عالم کیجانب سے اس فیصلہ پر اظہار ناراضی کا ذکر ہے) اور دوسرے حضرات نے صدیق اکبر رض کی رائے ہی کو صواب قرار دیا ہے کیونکہ بالآخر شرعی حکم وہ ہی قرار پایا ہے، جو حضرت صدیق کی رائے تھی (یعنی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دینا) نیز یہ رائے اس ازلی فیصلہ کے مطابق تھی جو اللہ تعالےٰ کے علم میں مقدر تھا۔ نیز یہ رائے اس رحمت الٰہیہ کے موافق بھی ہے جو غضب پر غالب ہے۔

الغرض یہ اظہار ناراضی بعض وقتی امور کیوجہ سے پیش آیا ہے ورنہ خداوند عالم نے بھی ہمیشہ کے لئے اسی حکم کو جاری رکھا ہے جو اس فیصلہ میں حضرت صدیق کی رائے پر کیا گیا تھا۔

ایک اور واقعہ | اسی غزوۂ بدر میں جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

صحابہ کرام کی مختصر جمعیت کے ساتھ محاذ جنگ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان اپنے قافلہ کو لیکر نکل گیا ہے۔ مگر قریش کا بڑا لشکر جو اس قافلہ کی امداد کیلئے مکہ سے آیا ہے ابھی اس میدان کے کنارہ پر پڑا ہے۔ تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اب جنگ کو شروع کیا جائے یا ملتوی کر دیجائے اس مجلس شوریٰ کی روئداد حضرت انسؓ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شاور حیث بلغہ اقفال ابی سفیان۔ فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقال سعد بن عبادۃ ایانا تزید یارسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضہا البحر لاخضناہا ولو امرتنا ان نضرب اکبادہا الی برک الغماد لفعلنا۔ رواہ ابن ابی شیبہ۔ (کذا فی الکنز صفحہ ۲۷۳ ج ۵)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوسفیان کے نکل جانے کی اطلاع ملی تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا۔ اول صدیق اکبرؓ نے رائے پیش کی تو آپ نے اُن سے رُخ پھیر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنا خیال ظاہر کیا تو اُنسے بھی اعراض کیا۔ پھر سعد ابن عبادہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ ہماری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر آپ یہ حکم فرمائیں کہ ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈالدیں تو ہم فوراً کود پڑیں گے اور اگر آپ یہ امر فرمائیں کہ مقام برک غماد تک گھوڑے دوڑائیں تو یقیناً ہم اطاعت کریں گے۔

اس مجلس مشورہ کے طرز عمل سے بھی قطعی طور پر معلوم ہوا۔ اسلامی جلسہ شوریٰ موجودہ جمہوریت کی طرح کثرت رائے کا محکوم نہ تھا۔

تیسرا واقعہ غزوۂ اُحد میں جب کفار مکہ کا لشکر مدینۃ الرسولؐ کے قریب آپہنچا تو

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اس مشورہ میں بھی اختلاف رائے کی نوبت آئی۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ مسلمانوں کا لشکر شہر مدینہ سے باہر نہ نکلے بلکہ جب کفار شہر میں داخل ہونے لگیں تو گلی کوچوں میں متفرق طور پر مقاتلہ کیا جائے اور چھتوں کے اوپر سے عورتیں انکی امداد کریں۔ خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی یہی رائے تھی اور بعض صحابہ اس کے خلاف تھے وہ کہتے تھے کہ ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ مختلف رائیں سُنکر گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے اور ان لوگوں کی رائے کے موافق تیاری شروع کی جو مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کا مشورہ دیتے تھے۔ لیکن جب ادھر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم نے آنحضرت علیہ وآلہ وسلم پر اصرار کر کے آپ کو اپنی رائے کے خلاف پر مجبور کر دیا۔ یہ مناسب نہیں۔ یہ سوچ کر ان سب کی رائے بدل گئی اور جب آپ باہر تشریف لائے تو متفقہ طور پر یہ عرض کی کہ مدینہ کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ماینبغی لنبی اذا لبس لأمتہ ان یضعھا حتی یحکم اللہ بینہ وبین عدوہ۔	کسی نبی کے لئے مناسب نہیں جب وہ اپنی زرہ پہن لے کہ اس کو پھر رکھ لدے جبتک کہ حق تعالےٰ اسکے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ فرمائے

الغرض آپ نے اسی رائے کو نافذ فرمایا۔ اور ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لیکر باہر تشریف لے گئے (کذا فی زاد المعاد صفحہ ۳۴۸ جلد ۱)

اس واقعہ میں بھی چند وجوہ سے ہمارے مسئلہ زیر بحث پر روشنی پڑتی ہے

(۱) اوّل اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فیصلہ ابتداءً فرمایا تھا اس میں کثرت و قلت کی کوئی گفتگو درمیان میں نہیں آئی۔ بلکہ جس رائے کو آپ نے نافذ فرمایا تھا اس کی ترجیح کیوجہ روایات کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ جماعت فضلائے صحابہ پر مشتمل تھی اور ان کی قوت رائے باعث ترجیح ہوئی۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

فبادر جماعة من فضلاء الصحابة ممن فاته الخروج يوم بدر و اشاروا عليه بالخروج والحوا عليه فی ذلك (زاد المعاد صفحہ ۳۴۸ / ۱۲)	ان فضلاء صحابہ کی ایک جماعت آگے بڑھی جنکو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں مل سکا تھا تو انھوں نے یہی مشورہ دیا کہ آپ باہر نکل کر جنگ کریں اور اس رائے پر اصرار کیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ بعد میں جب ان حضرات کی رائے بدل لی اور سب نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ شہر کے اندر ہی مقابلہ کیا جائے۔ تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کے خلاف خروج ہی کے حکم کو نافذ فرمایا۔

یہ چند واقعات ہیں جن سے حضرت نبوت کی مجلس شوریٰ کے طرز عمل کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور بالجملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں میں اہل شوریٰ کی رائیں شمار کرنے اور پھر کثرت پر فیصلہ کرنے کی ایک نظیر بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد ہم خلفاء راشدین کی مجلس شوریٰ اور اس کے طرز عمل کو چند واقعات کے ذریعہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

خلفائے راشدین کی مجالسِ شوریٰ

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مشاورات اور

انکا طرزِ عمل اگرچہ قواعد اصول کے مطابق تمام اُمت کے لئے اُسوہ ہے۔ اور جب تک تخصیص کی کوئی صریح دلیل معلوم نہو اس وقت تک اُس طرزِ عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص کہنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن تاہم کسی کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ آپ تو بوجہ عہدۂ نبوت خود مشورہ کے بھی محتاج نہیں تھے، اور اسی وجہ سے تمام اُمت کے مقابلہ میں آپکی تنہا رائے راجح ہو سکتی ہے۔ لیکن نبی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لئے یہ اختیار ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اسکے بعد ہم خلفاء راشدین کا طرز عمل اور انکی مجالس شوریٰ کا اجمالی نقشہ بھی ناظرین کے لئے پیش کردیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی مجلس شوریٰ

فریضہ زکوٰۃ چھوڑنے والوں پر جہاد اور صحابہ کی رائیں

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مدینہ میں نفاق پھیل گیا اور عرب مرتد ہونے لگے ادھر عجم میں بھی یہی سمّی ہوا اثر کر گئی اور مرتد ہو کر مقابلہ کی دھمکیاں دینے لگے۔ اور ان کی زبانوں پر یہ باتیں آگئیں کہ یہ شخص جس کی وجہ سے مسلمان تمام اقوام پر بھاری تھے اور جس کی وجہ سے ہر جنگ میں ان کی مدد ہوتی تھی (یعنی رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم) وفات پا گئے اور اب مسلمانوں کا مٹا دینا سہل ہو گیا ہے۔

خلیفہ وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھ کر مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور یہ تقریر فرمائی کہ:

آپ کو معلوم ہے کہ عرب نے زکوٰۃ ادا کرنی چھوڑ دی اور وہ اپنے دین سے مرتد[1] ہو گئے ادھر عجم نے تمہارے مقابلہ کے لئے نہاوند کو تیار کر رکھا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان جس شخص کیوجہ سے ہمیشہ مظفر و منصور ہوتے تھے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ آج انتقال کر گئے ہیں (اسوقت موقع ہے کہ مسلمانوں کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے کیونکہ میں بھی تمہیں میں سے ایک شخص ہوں۔ اور مجھ پر بہ نسبت تمہارے اس مصیبت کا بوجھ زیادہ ہے۔

اعیان صحابہ مہاجرین و انصار کا مجمع ہے لیکن یہ واقعہ سنکر سب پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہے اور کوئی کچھ نہیں بولتا یہاں تک کہ ایک طویل سکوت کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر شروع کی اور فرمایا۔

"اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخدا میری رائے تو یہ ہے کہ آپ (وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اس وقت) عرب سے نماز ادا کرنے ہی کو غنیمت سمجھیں۔ اور فریضۂ زکوٰۃ کے چھوڑنے پر مواخذہ نکریں۔ اس لئے کہ یہ لوگ اسلام میں ابھی ابھی داخل ہوئے ہیں ابتک اسلام ان کے دلوں میں رچا نہیں۔ پھر یا تو اللہ تعالیٰ انکو ہدایت کی طرف پھیر دے گا اور یہ تمام اسلامی فرائض و احکام کو تسلیم کر کے سچے مسلمان ہو جائیں گے۔ اور یا اللہ تعالیٰ اسلام

---

[1] ارتداد کیوجہ یہی زکوٰۃ کا انکار تھا کیونکہ فرض قطعی کا انکار کفر ہے اور یہ لوگ بھی اس فرض کے منکر ہو گئے تھے اسلئے مرتد قرار دیئے گئے ورنہ فقط زکوٰۃ ادا نہ کرنیسے کافر نہیں ہوتا بلکہ سخت گنہگار اور فاسق ہوتا ہے ۱۲ منہ

کو قوت دیدے گا تو ہم اُن کے مقابلہ پر قادر ہو جائیں گے۔
اس وقت مقابلہ کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت تو موجودہ
مہاجرین و انصار میں تمام عرب و عجم کے مقابلہ کی سکت
نہیں۔"

حضرت فاروق کی رائے سُننے کے بعد صدیق اکبرؓ حضرت عثمانؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُنھوں نے بھی حرف بحرف حضرت فاروق کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی اسی کی تائید کی۔ ان کے بعد تمام مہاجرین اسی رائے کی تائید میں یک زبان ہو گئے۔

یہ دیکھ کر حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ انصار کی طرف متوجہ ہوئے اُنھوں نے بھی متفقہ طور پر یہی رائے ظاہر کی کہ اس وقت ان سے مقاتلہ قرین مصلحت نہیں۔ یہ سنکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ تقریر کے لئے منبر پر چڑھے۔

یہ افضل الناس بعد الانبیاء۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی مجلس شوریٰ کا ایک واقعہ ہے۔ جس میں شوریٰ کے تمام ارکان بلا استثناء امیر کی رائے کے خلاف رائے پیش کرتے ہیں۔ اب سُنئے کہ یہ مسلمانوں کا سب سے پہلا امیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا پہلا خلیفہ اس واقعہ میں کیا فیصلہ دیتا ہے، تاکہ ہمارے مسئلہ زیر بحث کا فیصلہ صاف طور پر خلیفہ اوّل کے عمل سے ہو جائے۔

حضرت صدیق کا یہ خطبہ چونکہ فصاحت و بلاغت اور شوکت و جلالت کا ایک خاص نمونہ ہے اس لئے عربی دان طبقہ کی دلچسپی کے لئے اس کے اصل الفاظ

بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

اما بعد فان اللہ بعث محمدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم والحق قلّ شرید والاسلام غریب دابد قدرث حبلہ وقل اھلہ فجمعھم اللہ تعالے بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وجعلھم الامۃ الباقیۃ الوسطی واللہ لا ابرح اقوم بامر اللہ واجاھد فی سبیل اللہ حتی ینجز اللہ تعالی لنا وینفی لنا عھدہ فیقتل من قتل منا شھیدا فی الجنۃ ویبقی من بقی خلیفۃ اللہ فی ارضہ ووارث عبادہ الحق فان اللہ قال ولیس لقولہ خلف وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ واللہ لو منعونی عقالا کانوا یعطون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثم اقبل معھم الشجر والمدر والجن والانس لجاھدتھم حتی تلحق روحی باللہ ان اللہ لم یفرق

حمد و نعت کے بعد ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے وقت مبعوث فرمایا جبکہ دنیا میں حق نہایت قلیل اور گمنام تھا اور اسلام محض اجنبی اور غیر مقبول تھا۔ اسکی رسی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اور اسکے اہل کم رہ گئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انکو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں جمع فرمایا اور انھیں قیامت تک باقی رہنے والی معتدل اُمت بنادی۔ خدا کی قسم میں برابر امر الٰہی پر قائم رہوں گا اور خدا کے راستہ میں جہاد کروں گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمادیں۔ اور ہم میں سے جو قتل ہو وہ شہید ہو کر جنت میں جائے اور جو زندہ رہے وہ خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے بندوں کا وارث ہو کر رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے (اور اس کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔) کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے۔ کہ وہ انکو زمین کا خلیفہ بنائے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ خدا کی قسم اگر وہ لوگ جو زکوٰۃ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیتے تھے اس میں سے ایک رسی بھی روکیں گے تو میں ان سے برابر جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میری روح

بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ بل جمعھما رواہ الخطابی فی رواۃ مالك ۔ (کذا فی الکنز صفحہ ۱۴۲ ج ۳)

خدا تعالیٰ سے جا ملے۔ اگرچہ اسوقت انکی امداد کیلئے دنیا کا ہر درخت اور پتھر اور جن وانس میرے مقابلہ کیلئے جمع ہو جائیں کیوں کہ خدا تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا بلکہ دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے

حضرت صدیق کے اس پر شوکت خطبہ نے مجمع کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ تقریر ختم ہوتے ہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زور سے اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ جس کام کے لئے اللہ تعالےٰ نے ابو بکر کا شرح صدر فرمایا ہے۔ میرا بھی اس پر شرح صدر ہو گیا۔

لیکن اس وقت بھی صرف فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت منقول ہے اور کسی کی تائید میری نظر سے نہیں گذری۔ بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بدستور اس کی مخالفت پر قائم رہنا اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جہاد پر عزم مصمم کر کے مدینہ سے چل کھڑے ہوئے اور مقام ذی القصہ تک پہنچ گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آگے بڑھکر گھوڑے کی باگ تھام لی اور فرمایا کہ اے خلیفہ رسول اللہ آپ کدھر جاتے ہیں۔ آج میں بھی آپ سے وہی کہتا ہوں جو غزوہ اُحد میں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا تھا یعنی

شِمْ سیفك ولا تفجعنا بنفسك فواللہ لئن اُصِبْنا بك لا یکون للاسلام بعدك نظام ابدًا رواہ الدار قطنی فی غرائب مالك (کنز صفحہ ۱۴۳ ج ۳)

اپنی تلوار کو میان میں کیجئے اور ہمیں اپنی ہستی سے محروم نہ کیجئے۔ کیونکہ خدا کی قسم اگر آپ کے قتل کی مصیبت ہم پر پڑ گئی تو پھر آپ کے بعد اسلام کا کبھی نظام درست نہ ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس تقاضا و اصرار پر خلیفہ اول خود تو واپس مدینہ میں تشریف لے آئے۔ مگر اصل عزم کو نہیں چھوڑا

بلکہ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر ان مرتدین کی طرف روانہ فرما دیا۔

اس واقعہ میں خلیفہ اول رضؓ کے فیصلہ نے ہمارے مسئلہ زیر بحث کا نہایت وضاحت سے فیصلہ کر دیا ہے کہ اگر مشورہ میں اختلاف آراء کی نوبت آئے تو ان سب آراء مختلفہ کو سننے کے بعد امیر کی رائے جس جانب پر قائم ہو جائے بس وہی قابلِ انفاذ ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضؓ کی انتظامی خصوصیت

خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انتظامی خصوصیت اور اس کی انتہائی قابلیت فقط اہلِ اسلام میں نہیں بلکہ تمام دنیا کے قدیم و جدید سیاسی طبقوں میں بلا خلاف تسلیم کی جا چکی ہے۔ اور اسی لئے ہمارے مسلمانوں میں بھی جن حضرات کے نزدیک یورپین تمدن و معاشرت ہی تمام خوبیوں کا معیار ہے اور روشن خیالی اسی کا نام ہے کہ اسلامی قبار کو کھینچ تان کر اس جسم نازیبا پر راست بنا دیں اگرچہ اس کھینچا تانی سے خود قبار پھٹ جائے۔ اُنھوں نے یورپ کی موجودہ جمہوریت کو بھی جب اسلام کے سر تھوپنے کی ٹھانی تو اس کا ذمہ دار حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ٹھہرایا ہے۔

اس لئے عہد فاروقی کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مجموعہ سے اس میں شبہ نہیں رہتا کہ خلافت فاروقی کے زمانہ میں بھی جب کہ سیاسی انتظامات کمال کو پہنچ چکے تھے۔ خلیفۂ وقت کثرت رائے کا محکوم نہ تھا۔ بلکہ صحیح معنی میں

حاکم تھا اور ہر مختلف فیہ مسئلہ میں آراء مختلفہ سننے کے بعد جس جانب کی ترجیح پر اس کا شرح صدر ہوتا تھا۔ وہی تمام ممالک کے لئے نافذ ہوتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ امیر کے شرح صدر کا سبب کبھی کثرت رائے ہی ہو جائے اور کبھی دوسری وجوہ۔

امام ابو جعفر طبری بحوالہ صحیح بخاری و مسلم نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ شام کی طرف چلے اور مقام سرغ[1] تک پہنچ گئے۔ تو شام کے اسلامی حکام اور فوجی سردار آگے بڑھکر یہاں آملے۔ اور خبر دی کہ آجکل شام میں وبار (طاعون) پھیلی ہوئی ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ خبر سنکر حضرت عمرؓ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مہاجرین اولین کو جمع کرو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ جب سب جمع ہو گئے تو وبار کی خبر سنا کر اُن سے مشورہ طلب کیا۔ اُن کے آپس میں اختلاف ہوا۔ بعض نے عرض کیا کہ آپ ایک اسلامی کام کے لئے نکلے ہیں۔ اس لئے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ اب اس کو چھوڑ کر واپس ہو جائیں۔ اور بعض نے کہا کہ آپ کے ساتھ خدا کی ایک عظیم مخلوق اور تمام صحابہ کرام کا جتھا ہے۔ ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے کہ آپ ان سب کو وبار میں ڈالدیں۔ خلیفہ وقت نے یہ اختلاف رائے سنکر نہ دونوں کے عدد شمار کئے اور نہ کثرت و قلت کو دیکھا۔ بلکہ سب کو رخصت کر دیا۔ اور پھر حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ انصار کو جمع کرو۔ جب وہ جمع ہو گئے تو ان

---

[1] مدینہ طیبہ سے تیرہ منزل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ گاؤں وادی تبوک میں واقع ہے (الریاض النضرہ صفحہ ۷، جلد ۲) ۱۲ منہ

سے بھی یہی مشورہ طلب کیا انہیں بھی بعینہ یہی اختلاف رائے پیش آیا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی رخصت کر دیا۔

اور پھر حضرت ابن عباس رضؓ سے فرمایا کہ اب ان سن رسیدہ قریشی مہاجرین کو جمع کرو جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو جمع کیا۔ ان سب نے یہ معاملہ سنکر یک زبان ہوکر کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ آپ واپس لوٹ جائیں اور اس تمام خلق اللہ کو وبا کی آگ میں نہ ڈالیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے یہ سُنکر لشکر میں اعلان فرما دیا کہ ہم علی الصباح یہاں سے مدینہ کو واپس ہو جائیں گے۔

صوبہ شام کے امیر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا آپ تقدیر خداوندی سے بھاگتے ہیں۔ فاروق اعظم چونکہ ان کی بہت قدر کرتے اور انکے خلاف کو پسند نہ کرتے تھے۔

اس لئے فرمایا کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور ایسا کہتا تو بعید نہ تھا (لیکن تم جیسے فہیم آدمی سے ایسا اعتراض بعید ہے) سن لو کہ بیشک ہم تقدیر خداوندی سے تقدیرِ خداوندی ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ خلق اللہ کو ہلاکت اور مضرت کی جگہوں سے بچانا بھی حکم خداوندی ہی ہے لہٰذا ہم ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں اس میں کیا مضائقہ ہے)

اور پھر فرمایا کہ اگر آپ کسی جنگل میں اپنے اونٹ چرانے کے لئے لیجائیں اور ایسی جگہ میں جاکر اُتریں جس کے دو حصہ ہوں ایک قحط زدہ اور خراب اور دوسرے میں سبزہ لہلہاتا ہو تو کیا یہ بات صحیح نہیں کہ اگر آپ خراب حصہ میں

چرائیں گے وہ بھی تقدیر خداوندی سے چرائیں گے۔ اور اگر اچھے سبزہ زار میں چرائیں گے تو وہ بھی تقدیر الٰہی سے ہوگا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ اتفاقاً اس وقت پہنچ گئے اور واقعات سن کر فرمانے لگے کہ مجھے اس کا شرعی حکم معلوم ہے۔ کیونکہ میں نے خود حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے کہ :-

اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا علیه واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارًا منه۔	جب سنو کہ کسی شہر میں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر جس جگہ تم پہلے سے موجود ہو وہاں طاعون آجائے تو وہاں سے نہ نکلو۔

حضرت فاروق رضؓ نے یہ سن کر خدا تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ اور حسب ارادہ واپس ہوگئے۔ اس واقعہ نے صاف طور پر بتلا دیا کہ مشورہ کا فیصلہ اسلامی خلافت میں کثرت رائے کے حوالہ نہ تھا۔ بلکہ مشورہ کی غرض محض یہ ہوتی تھی کہ لوگوں کی رائیں سن کر مسئلہ کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں اور پھر جس چیز پر امیر کا شرح صدر ہو وہ عمل میں لایا جائے۔

اس واقعہ میں جب تک حضرت فاروق کو شرح صدر حاصل نہیں ہوا مجلس شوریٰ کو بدلتے رہے لشکر کی تنظیم اور مال غنیمت وغیرہ کی تقسیم کے بارہ میں بھی جب حضرت فاروق رضؓ نے مجلس مشورت طلب فرمائی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عثمان رضؓ اور ولید ابن ہشام ابن مغیرہ رضؓ وغیرہم کی مختلف رائیں مجلس میں پیش ہوئیں۔ اس وقت بھی حضرت فاروق رضؓ نے کثرت و قلت کی طرف کوئی التفات نہیں فرمایا۔ بلکہ ولید ابن ہشام کی رائی کو زیادہ قوی اور مفید

سمجھ کر اسی کو نافذ فرمادیا۔ سیوطی رح نے تاریخ الخلفاء میں اس مشورہ کے فیصلہ کے متعلق جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ اس کے لئے شاہد عدل ہیں۔ وہی لہٰذا۔

فاخذ بقولہ (ای بقول ولید) تاریخ الخلفاء ص۱۳۱ — آپ نے ولید کے قول کو قبول کر کے نافذ کیا۔

یہ چند واقعات ہیں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مجالس مشورت کے جن کے دیکھنے کے بعد ایک مسلمان کو اس میں تردد نہیں رہ سکتا کہ اسلامی مشورہ کا فیصلہ کثرتِ رائے کا محکوم نہیں ہوتا۔

خیال تھا کہ اسلامی تاریخ سے اس سلسلہ کی پوری تکمیل کی جائے اور حضرت عثمان غنی رض اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے بعد جمہور خلفاء اسلام کی مجالس مشاورت کی روداد پیش کر کے مسئلہ زیر بحث کو مؤید و مشید کیا جائے لیکن ایک طرف تو ہجوم افکار و حوادث اور ضیق وقت و قلت فراغت اس میں سنگ راہ ہو رہی تھی دوسری طرف یہ بھی خیال ہوا کہ ایک حق طلب مسلمان کی تشفی و اطمینان کے لئے تو اس قدر بھی کافی ہے۔ اور معاند و مخالف کے لئے ہزار دفتر بھی مفید نہیں۔ اس لئے اس تاریخی سلسلہ کو یہیں ختم کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ آخر میں کثرت رائے کی حقیقت اور اس کے ایک گونہ فائدہ پر بھی متنبہ کر دینا ضروری ہے

کثرت رائے کی حقیقت اور اس کا فائدہ

اگر مشورہ کی حقیقت اور اس کی اصلی غرض پر نظر کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

مشورہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ زیر غور معاملہ کی تمام جوانب منافع اور مضار روشنی میں آجائیں اور پھر مشورہ لینے والا جس جانب کو اختیار کرے علیٰ بصیرۃ اختیار کرے۔ کیونکہ بہت مرتبہ ایک کام کے منافع انسان کے سامنے ہوتے ہیں اور اس کی مضرتوں کا اس کو علم نہیں ہوتا یا ان سے ذہول ہوتا ہے مشورہ سے اس کے تمام مضر اور نافع پہلو واضح ہوکر ایک جانب کو علی بصیرۃ ترجیح دینے پر قدرت ہوجاتی ہے یہ ہے مشورہ کی اصلی غرض اور مقصد اس کا مقتضی خود یہ ہے کہ مشورہ طلب کرنے والا بعد مشورہ کے بھی ایسا ہی آزاد رہے جیسا قبل از مشورہ تھا۔ قلت وکثرت کا محکوم نہو بلکہ مسئلہ کے تمام جوانب کو دیکھ کر جو اس کی رائے قائم ہو اُسی کو توکلاً علی اللہ اختیار کرے۔

اور درحقیقت کسی رائے کے صائب اور مفید ہونے کو کثرت وقلت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعید نہیں کہ کثرت رائے اکثر غیر مفید بلکہ مضر جانب پر ہوا کرے۔

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سرسید احمد خاں صاحب سے اس مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب لطیفہ بیان کیا کہ اس عالم میں باتفاق عقلائے دنیا اچھی چیزیں کم ہیں اور بُری زیادہ تمام طبقات عالم میں یہ کلیہ مشاہد ہے بالخصوص انسان میں تو بہت ہی واضح ہے۔ دنیا کی تمام مردم شماری کے ساتھ جب اہلِ علم وفضل اور کسی طبقہ کے اہل کمال اور صائب الرائی لوگوں کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ہزار میں ایک بھی بمشکل نکلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بے وقوف اور ناتجربہ کاروں کی بہت کثرت ہے اور

عقلاء و تجربہ کاروں کا سخت قحط۔ لہٰذا کثرت رائے کا فیصلہ اکثر حماقت اور بے وقوفی کے فیصلہ کا مرادف ہوگا۔

اور حقیقت یہی ہے کہ ذرا سے غور کرنے پر یہ بات مشاہد ہو جاتی ہے کہ کسی رائے کے صواب اور قابل عمل ہونے کیلئے کثرت کا اس کی طرف ہونا ہرگز معیار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کثرت و قلت کو اس سے کچھ تعلق ہے۔ ایک ماہر اور تجربہ کار انسان کی تنہا رائے ایسے سیکڑوں انسانوں کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے جنھیں مہارت و تجربہ نہیں۔

الغرض رائے کی خطا و صواب معلوم کرنے کے لئے کثرت کی طرف جانا بالکل عقل سلیم کے خلاف ہے۔

البتہ کثرت رائے پر عمل کرنے میں ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ اس سے بظاہر نزاع قطع ہو جاتا ہے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا کہ امیر نے کسی فریق کیجانب داری کی۔ لیکن اس نزاع اور پھر قطع نزاع کی صورت و ضرورت جبھی پیش آتی ہے جبکہ لوگوں کے قلوب آجکل کی بے معنی آزادی سے متاثر ہوں کہ انھیں اپنی رائے چھوڑ دینا اور خلق اللہ کے مفاد پر اپنی شخصی رائے کا ایثار کر دینا مصیبت گذرتا ہو اور ہر شخص اپنے آپ ہی کو متبوع و مطاع سمجھتا ہو۔

مگر جس مذہب کی تمام تعلیم کا خلاصہ ایثار و اخلاص اور تواضع و مسکنت ہو اس کو کیا ضرورت ہے کہ یہ صورت اختیار کرے جو لوگ اس تعلیم سے متاثر ہونگے وہ تو اپنی رائے کے خلاف پر بھی بعد حکم امیر اسی طرح راضی ہوں گے جس طرح موافقت پر۔ اور جو لوگ اس سے متاثر نہیں انہیں سلطنت کی قوت متاثر کریگی۔

خلاصہ یہ کہ کثرت رائے کو ترجیح دیدینا درحقیقت قرعہ کی مثال ہے کہ اس سے نزاع ایک حد تک قطع ہوجاتا ہے۔ لیکن وضوح حق کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ پس الحمدللہ ثابت ہوگیا کہ نظام عالم کی درستی کے لئے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ہرگز ہرگز مفید نہیں ہے۔

آزادی اور غلامی کا بے معنی راگ

حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ کے روشن خیال حضرات اطاعت امیر کو غلامی کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں موجودہ جمہوریت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جمہوریت آزادی خیال اور حریت کی حامی ہے۔ لیکن اگر ذرا عقل سے کام لیں تو اس بارہ میں دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ کیونکہ اطاعت امیر اگر آزادی کے خلاف اور ایک گونہ غلامی ہے تو پارلیمنٹ یا ممبران کونسل کی اطاعت میں کونسی فضیلت ہے کہ اس کو غلامی نہ کہا جائے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ خلافت اسلامیہ میں تمام رعایا (ان کے قول پر) ایک شخص کی غلام بنتی ہے تو یہاں جمہوریت میں دس آدمیوں کا غلام بننا پڑتا ہے۔ کیونکہ جس طرح اسلامی خلافت میں امیر کے خلاف کسی شخص کو کوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں اسی طرح جمہوریت میں بھی ممبران مجلس میں سے اکثر نے جو فیصلہ کردیا وہ ہی سارے ملک کو ماننا پڑتا ہے اگرچہ سب کی رائے کے خلاف ہو۔ اس وقت ان آزاد خیال احرار سے کوئی پوچھے کہ یہ کونسی آزادی ہے جس کی خاطر اصول اسلامیہ کو چھوڑا جاتا ہے۔ آزادی اور حریت تو جب تھی کہ آپ اپنی اپنی رائے کے پابند ہوتے اور جو چاہتے کرتے۔ الغرض اگر آزادی کے یہ معنی ہیں کہ انسان جو چاہے کرے اور اپنی رائے کو کسی وقت نہ چھوڑے تو جب تک آدمی کسی سیاست و نظام کا

پابند ہو اس کو آزاد کہنا بالکل بے معنی ہے۔ نہ شخصیت کے ماتحت رہ کر ایسا آزاد ہو سکتا ہے اور نہ جمہوریت کے ماتحت رہکر اور اگر آزادی اور آزاد خیالی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی رائے پیش کرنے میں آزاد ہے تو یہ آزادی دونوں صورتوں میں کہیں نہیں جاتی اور جس طرح جمہوریت میں اس کی رائے سُنی جا سکتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ٹھنڈے دل سے اسلامی خلافت کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بلکہ اگر حالات کی تفصیل پر نظر ڈالی جائے تو موجودہ جمہوریت میں آزادی رائے کا نام نہیں سارے ملک میں سے صرف چند ممبروں ہی کو اہل الرائے قرار دیا ہے اور بس یہی وجہ ہے کہ اگر رعایا کے افراد میں سے کوئی شخص نہایت تجربہ کار اور ماہر سیاست عالم فاضل اپنی رائے پیش کرنا چاہے تو اگر یہ باضابطہ ممبر نہو تو اس کی رائے کو کوئی رائے ہی نہیں سمجھا جاتا اور نہ قصر جمہوریت تک اس غریب کی آواز پہنچ سکتی ہے۔ بلکہ اگر قانون انتخاب ممبران کو دیکھا جائے تو اکثر ایسے شخص کو ممبری میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہاں تو ممبری کا مدار کثرت مال اور حیثیت اور جائیداد وغیرہ پر ہے۔ گویا اہل الرائے اور عاقل کی تعریف جمہوریت کے قانون میں یہ ہے کہ زیادہ پیسہ والا ہو۔ یا للعجب کثرت مال کو اہل الرائی اور صائب الفکر ہونے سے کیا تعلق بلکہ اقوام عالم کا اکثری تجربہ بالکل اس کے خلاف ثابت کرتا ہے کہ مالداری کی ہوس اور ثروت کا نشہ انسان کے قوائے دماغیہ پر عموماً اس طرح چھا جاتا ہے کہ اسے دوسروں کی راحت و آرام کی مطلق پرواہ نہیں رہتی۔

الغرض جمہوریت کے قانون میں رائے پیش کرنے کا بھی صرف وہی شخص مجاز ہے۔ جس کی گرہ میں ٹکے زیادہ ہوں چاہے دماغ عقل سے خالی ہو۔

اور پھر رائے پیش کرنے کے بعد وہ بھی آزاد نہیں بلکہ کثرت کے فیصلہ کا پابند ہے چاہے اس کے موافق ہو یا مخالف۔

بخلاف اسلامی خلافت کے کہ وہاں آزادی رائے میں مساوات کا کھلا ہوا اعلان ہے اور جو شخص اپنی رائے کسی معاملہ میں پیش کرنا چاہے اس کو ٹھنڈے دل سے سنکر اس پر بھی اسی طرح غور کیا جاتا ہے جس طرح ممبرانِ شوریٰ کی رائے پر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مدار کار ممبران شوریٰ کی رائیں ہوتی ہیں۔ اور ان سے مشورہ طلب کرنا ضروری ہوتا ہے دوسروں سے طلب کرنا ضروری نہیں۔ لیکن اگر وہ خود پیش کرنا چاہے تو کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔

اس سے ثابت ہوا جو حقیقی آزادیٔ رائے اسلامی خلافت میں ہے نہ موجودہ جمہوریت میں پائی جاتی ہے اور نہ ملوک عجم کی شخصیت میں اور اسی سے ہمارا اصلی دعویٰ بھی بحمداللہ ثابت ہوگیا کہ

خلافتِ اسلامیہ نہ موجودہ جمہوریت کا نام ہے نہ شخصیت کا

بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور محکم قانون کا نام ہے جو نظام عالم کی اصلاح کے لئے بہترین کفیل ہے۔ جس میں ایک حد تک تمام رعایا کو حقوق مساوات دیئے گئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی فرق مراتب کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا گیا۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے انسان کے لئے کچھ حدود مقرر کی ہیں۔ اپنی حدود میں ہر شخص مکمل آزاد ہے۔ البتہ اس حد سے آگے آزادی دینا چونکہ دوسروں کے حقوق ضائع کرنے کا مرادف اور نظام عالم کے خلاف ہے اس لئے بالکل شتر بے مہار بھی نہیں کر دیا گیا۔ اگر ایک طرف تمام رعایا پر اطاعت امیر فرض کی تو دوسری طرف رعایا کے ہر

چھوٹے بڑے کو اس کا بھی حق دیا کہ اگر امیر کو کوئی کام خلاف شرع کرتا ہوا دیکھے تو (آداب امر بالمعروف کا لحاظ رکھتے ہوئے) صاف صاف اس کو غلطی پر متنبہ کر دے۔

نیز معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں :-

پانچواں مسئلہ مشورہ میں اختلاف رائے ہو تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی۔ اختلاف کی صورت میں امیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے۔

(معارف القرآن ص ۲۳۵ ج ۲)

یہاں پہونچکر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح کا طویل محققانہ مضمون ختم ہوا اس کے بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کا مضمون پیش کیا جاتا ہے۔

امیر اور حق فیصلہ

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ہاں پھر باوجود امیر کے پابند مشورہ کر دیئے جانے اور بغیر مشورہ قدم نہ اُٹھانے کے مرجع الامر اور مطاع خلائق خلیفہ و امیر ہی کو قرار دیا گیا ہے یعنی اُمور مشورہ طلب میں بعد مشورہ فیصلہ کرنا امیر کا کام ہوگا نہ کہ شوریٰ کا۔ کیونکہ جیسے تجویز حکم نام ہے حکومت کا ایسے ہی حکم کی شقوق وجوانب میں انتخاب و ترجیح نام ہے خلافت و امارت کا اگر یہ ترجیح و انتخاب بھی شوریٰ ہی کا کام ہو تو ہر رائے دہندہ اپنی رائے کو مرجح قرار دے گا اور اس ترجیح کے اختلاف کے لئے پھر کسی مرجح کی ضرورت پیدا ہو جائیگی اور تسلسل کی سی صورت بن جائے گی۔ پس جو مبتلائے اختلاف آرا رہے وہ خود مرجح آرا نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ ادارہ (شوریٰ) خود ہی قوۃ فیصلہ کا بھی مالک ہوتا تو وہ اختلاف آرا میں مبتلا ہی کیوں ہوتا؟ اختلاف رائے خود ہی عدم فیصلہ کی دلیل ہے پس جو فیصلہ نہیں کر سکتا اُسے مالک فیصلہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

غرض مبتلائے اختلاف معالج اختلاف نہیں ہو سکتا اس لئے حدود دلائل میں رہ کر فیصلۂ ترجیح امیر کے ہاتھ میں ہونا ناگزیر تھا نہ کہ شوریٰ

کے ہاتھ میں۔ نیز جو حکم میں مشورہ لے گا وہی مشورہ قبول بھی کرے گا اور بیک دم دو متضاد مشوروں کا قبول کرنا ناممکن ہے اس لئے عقلاً بھی قبول کنندہ ہی کو ترجیح و انتخاب رائے کا بھی حق ہونا چاہیئے۔ پس یہ امیر ہی کا کام ہوگا کہ وہ مشوروں کی شقوق و جوانب میں سے موزوں ترین جانب اور اصلح ترین شق کا انتخاب کرے۔

کثرتِ رائے اور قوتِ رائے

اس سے کثرۃ رائے کو فیصلہ کا بنیادی اصول قرار دیدیئے جانے کی جڑ کٹ جاتی ہے یعنی امیر منتخب شوریٰ کی آراء میں رائے شماری کر کے اکثریت و اقلیت کا پابند نہ ہوگا بلکہ قوۃ دلیل کا پابند ہوگا۔ پس قوۃ دلیل اساسی چیز ہوگی نہ کہ کثرت رائے کہ زیادہ افراد کا کسی ایک جانب آجانا اسلام میں حق و باطل کے فیصلہ کے لئے کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے فی نفسہ اکثریت کو اسلامی قانون (قرآن حکیم) نے کوئی بھی وقعت نہ دیتے ہوئے حد درجہ غیر اہم ٹھیرایا ہے۔ اور دین و ملک اور دیانت و سیاست کے تمام ہی دائروں میں نفس اکثریت کی بے وقعتی اور بے اعتباری کھلے لفظوں میں ظاہر کی ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک سے زائد جگہوں میں فرمایا:۔

کثرت رائے کی بے وزنی

وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین۔

اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو۔

ولکن اکثر الناس لایؤمنون
لیکن اکثر آدمی ایمان نہیں لاتے۔

واکثرھم لایعقلون
اور ان میں سے اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

ولکن اکثر الناس لایعلمون
اور لیکن اکثر آدمی علم نہیں رکھتے۔

ولکن اکثرھم یجھلون
لیکن ان میں زیادہ جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔

ولکن اکثرھم للحق کارھون
اور ان میں اکثر لوگ حق بات سے نفرت کرتے ہیں

وان اکثرھم لفاسقون
اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

ومایتبع اکثرھم الا ظنًا
اور ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں

ان الظن لا یغنی من الحق شیئًا
اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں

وان کثیرا من الناس عن ایاتنا
اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے آدمی ہماری عبرتوں

لغافلون۔
سے غافل ہیں۔

وماوجدنا لاکثرھم من عھد
اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا۔

واکثرھم لکاذبون۔
اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔

ولقد ضل قبلھم اکثر الاولین
اور ان سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں۔

لقد حق القول علی اکثرھم فھم
ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے سو یہ

لایؤمنون۔
لوگ ایمان نہ لاویں گے۔

وکثیر حق علیہ العذاب
اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا ہے۔

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃً
کثرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی

کثیرۃ باذن اللہ
جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئیں ہیں۔

ویوم حُنین اذ اعجبتکم کثرتکم
اور حنین کے دن بھی جبکہ تمکو اپنے مجمع کی کثرت پر غرہ ہو گیا تھا

فلم تغن عنکم شیئًا وضاقت علیکم
پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کار آمد نہ ہوئی اور تم پر زمین باوجود اپنی

الارض بما رحبت ثم ولیتم	فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ
مدبرین۔	کھڑے ہوئے۔
قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو	آپ فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو تجھ کو ناپاک
ولو اعجبك كثرة الخبیث۔	کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہو۔
وان تطع اکثر من فی الارض یضلوك	اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ انکا کہنا ماننے لگیں
عن سبیل اللہ ان یتبعون	تو وہ آپکو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں اور وہ محض بے اصل خیالات
الا الظن وان ھم الا یخرصون۔	پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔

پس قرآن نے دنیا کی اکثریت سے ایمان کی نفی کی ہے۔ عقل کی نفی کی۔ علم کی نفی کی۔ محبت حق کی نفی کی۔ تحقیق حق کی نفی کی۔ تیقظ و بیداری اور فہم سلیم کی نفی کی۔ وفاء عہد کی نفی کی۔ ہدایت کی۔ ثواب آخرت اور جنتی ہونے کی نفی کی۔ جہاد میں اکثریت کے گھمنڈ پر فتح و نصرت کی نفی کی استعمالی اشیاء میں اکثریت سے حلال و طیب ہونے کی نفی کی۔ گویا واضح کر دیا کہ دنیا میں ہر دائرہ کی اکثریت معیار حق تو کیا ہوتی مرکز باطل ہے کیونکہ بلحاظ واقعہ دنیا کی اکثریت۔ حماقت۔ جہالت۔ کراہت حق۔ اٹکل کی پیروی۔ غفلت۔ بدعہدی ضلالت۔ عذاب اخروی۔ جہنم رسیدگی۔ شکست خوردگی وغیرہ کا شکار ہے۔ اس لئے محض عددی اکثریت اسلامی اصول پر کیا قابل وقعت قرار پا سکتی تھی کہ اُسے حقوق کے لئے فیصلہ کُن اصول تسلیم کیا جاتا اور امیر کو اُس کا پابند کر دیا جاتا۔

کثرۃ رائے کہاں اور کس شرط سے معتبر ہے

البتہ کثرت رائے کی شرعی حیثیت قطع نزاع سے زیادہ

کوئی اہمیت نہیں رکھتی جب کہ مسئلہ ذو جہتین ہو اور اُس کی دونوں جانبین مباح اور کسی نہ کسی جہۃ سے جواز کا پہلو رکھتی ہوں تو کثرت رائے سے ایک جانب کو ترجیح دی جا سکتی ہے بشرطیکہ یہ اکثریت اہل دیانت کی ہو ورنہ خائنوں یا بے احتیاط افراد کی اکثریت کے مقابلہ میں بلاشبہ اُن افراد کی اقلیت قابلِ ترجیح ہوگی جن کی دیانت و امانت مسلم اور جن کا فہم و ذوقِ سلیم معروف ہو۔ ساتھ ہی یہ ترجیح و تعیین منصوصات میں مخل نہ ہو اور محدثات کے لئے معین نہ ہو۔ نیز اُس کی پاس کردہ جانب پر اتنا زور بھی نہ دیا جائے کہ جانب مخالف قابلِ ملامت قرار پا جائے یعنی اس جائز الفعل والترک امر میں اگر جانب فعل کثرۃ رائے سے ترجیح پا جائے تو ترک فعل کی جانب مکروہ و ممنوع نہ ٹھہر جائے اور اگر جانب ترک مرجح قرار پائے تو فعل کی جانب قابل نکیر و ملامت نہ سمجھی جائے کہ اس کے بغیر وہ امر امر مباح نہیں رہ سکتا بلکہ اباحۃ کی حدود سے نکل کر یا حد واجب میں آجائے گا یا حد حرام میں اور ظاہر ہے کہ کسی مباح کو رائے سے خواہ وہ اکثریۃ کی ہو یا اقلیت کی واجب و حرام بنانا شارع کے سوا کسی کا بھی حق نہیں اور کہا جائے گا تو بھی ابتداع و بدعۃ ہوگا جسکی مذمت سے شریعت بھری پڑی ہے نیز یہ مرجح اکثریت بھی عوام کی معتبر نہیں بلکہ اُن اہل علم و فضل کی جنہیں ذوق تشریع اور حکمت شریعت سے حصہ ملا ہے۔ ورنہ عوام الناس کی رائے اگر کلیۃ بھی کسی مسئلہ میں پیدا ہو جائے تو اُس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اکثریت قاطع نزاع بن سکتی ہے جبکہ مباحات میں ہو اہل علم و فضل کی ہو اور پھر وہ حدود میں بھی رہے اتنی قیود کیساتھ مباحات کی جوانب کا تعین اجتماعی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ پس منصوصات فرائض واجبات سنن مستحبات۔ مکروہات۔ محرمات اور لا ینبغیات وغیرہ

بھی کثرت رائے کے اصول کے نیچے نہیں آتے پھر مباحات بفیصلہ عوام بھی اکثریت میں نہیں آتے۔ نیز ترجیح مباحات خارج از حدود اباحۃ بھی اکثریت کے تحت میں نہیں آتے اس لئے کثرۃ رائے کا دائرہ ان حدود وقیود اور متعدد شرائط کی بناء پر کافی تنگ ہوجاتا ہے جس میں عوام الناس یا رسمی کمیٹیوں کو طمع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پھر ساری شروط بھی جمع ہوجائیں مگر معاملہ ہو حقوق کا تو اُس میں محض عددی اکثریت کوئی حجیت کی شان نہیں رکھتی جب تک کہ قواعد شرعیہ اُس کی مساعدۃ نہ کریں پس۔ اصل فیصلہ قواعد شرعیہ پر ہوگا نہ کہ اکثریت کے عدد کے جمع ہوجانے پر اندریں صورت امیر کو مطلقاً اس عددی اکثریت کا تابع اور محکوم قرار دیدیا جانا بلاشبہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اکثریت محض قاطع نزاع کا درجہ الٰہی ہے نہ کہ حجت کا اور ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر قطع نزاع کا رتبہ اُس سے بڑھکر امیر کو حاصل ہے ورنہ امیر کی حاجت ہی نہ تھی اسلئے امیر محکوم اکثریت نہیں ہوسکتا ورنہ قلب موضوع ہوجائیگا اور امیر کی یہ محکومیت آمریت شوریٰ اور مجبوریت امیر پر منتج ہوگی جس کا حاصل لامرکزیت وفوضیت ہوگا۔ اور یہ بھی قلب موضوع ہے

بہرحال امارت بلا شوریٰ استبداد اور ڈکٹیٹری ہے اور شوریٰ بلا امیر فوضویت اور لامرکزیت ہے۔ اسلام نے اپنی کمال جامعیت واعتدال نوازی سے شخصیت وجمہوریت کو جمع کرتے ہوئے امیر مطاع رکھ کر تو لامرکزیت کو ختم کردیا تاکہ خلافت الٰہی تشتت اہواء اور مداخلت عوام سے محفوظ رہے اور بااثر شوریٰ رکھ کر امیر کے استبداد اور مطلق العنانی کو توڑ دیا ہے تاکہ انفرادیت اور شخصی جذبات وتجبر کا پوری اُمت شکار نہ بن جائے۔ پس اسلامی

حکومت میں شخصیت بھی ہے اور جمہوریت بھی۔ نہ شخصیت جمہوریت سے مستغنی ہے اور نہ جمہوریت شخصیت سے بے نیاز ہے اسلام نے شخصیت جمہوریت کے اس حکیمانہ جوڑ و بند سے دونوں کے انفرادی مفاسد سے تو امارت کو بچا لیا ہے۔ اور دونوں کے اجتماعی منافع سے اُسے مالامال کر دیا ہے۔ نہ رسمی جمہوریت کی افراط باقی رکھی نہ موروثی شخصیت کی تفریط قائم رکھی بلکہ امارت شورائیہ میں حقیقی اعتدال و جامعیت پیدا کر کے اُسے کامل ہیئۃ اداری عطا کر دی ہے۔ جو اسلام ہی کی عالمگیر شان ہو سکتی تھی پس اسلام میں امیر محتاج مشورہ بھی ہے اور صاحب عزم بھی ہے یعنی اس کی احتیاج کا پہلو بھی قائم ہے تاکہ وہ مغرور نہ ہو جائے اور اُس کے استقلال کا پہلو بھی قائم ہے تاکہ وہ ضعیف نہ ہو جائے کہ تنفیذ احکام میں رکاوٹ ہونے لگے۔ ان دونوں مقاموں کو قرآن نے جمع فرما کر اعلان کیا ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ	اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں شوریٰ کی حیثیت سے تو جمہوریت ہے اور نفاذ کی حیثیت سے شخصیت یہی صحیح نظام شخصی ہے۔

حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے حکیمانہ و محققانہ مضمون کے بعد مولانا محمد طاہر صاحبؒ کے رسالہ "الوحدۃ فی الاسلام" کو نقل کیا جا رہا ہے اس رسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ قدیم دار العلوم کا پورا نقشہ اس سے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه

رسالہ نافعہ

الوحدۃ فی الاسلام

(یعنی)

جسمیں مرکزیت وجمہوریت پر عقلاً عرفاً شرعاً نقد وتبصرہ کیا گیا ہے اور چند نظائر شرعیہ اور مقدس اکابر و بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے طریق کار اور اُنکے طرز عمل سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کی امارت عامہ۔ خاصہ دونوں میں وحدت ومرکزیت ہی اصل ہے اور یورپ کی خود ساختہ موجودہ جمہوریت کا اسلام ہرگز مؤید نہیں ہے۔

مؤلفہ

نبیرۂ حجۃ الاسلام مولانا محمد طاہر صاحب ابن احمد بن قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

ناظم کتبخانہ دارالعلوم دیوبند

مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند ضلع سہارنپور یوپی

الوحدۃ فی الاسلام

یعنی

مرکزیت و جمہوریت

پر

عقلاً ــــ عرفاً ــــ شرعاً ــــ نقد و تبصرہ

الحمد للہ وسلام علی نبی الوری اما بعد قوم نصاریٰ کی معاشرت اور ان کا طریق و تمدن جب سے ہندوستان اور دیگر بلادہائے اسلامی میں ازراہ حکومت و تجارت پھیلا ہے اس وقت سے اکابر اہلِ اسلام و مبصرین مذہب اس نتیجہ قطعی پر پہنچ چکے ہیں کہ نصرانیت کا سسٹم روحانیت و اسلامیت کے لئے سم قاتل اور حد درجہ مخرب و مہلک ہے ہندوستان کی مختلف المذہب قومیں اور نسلیں الناس علی دین ملوکہم کے فطری اصول کے ماتحت لون نصاریٰ سے اپنی روح اور جسم کو بڑی سرعت کے ساتھ رنگین بناتی چلی جارہی ہیں اور ہندوستان میں سے بھی قوم مسلم تو اس افرنجیت سے اس قدر متاثر ہے کہ دنیا کی تمام برائیوں کو بھلائیوں کے پیرایہ میں قبول کرنے میں آج وہ اول درجہ پر نظر آرہی ہے ہے یہی سبب ہے کہ آئے دن مسلمانوں کے نظامہائے دینی و دنیوی میں

قدامت وجدت کی جنگ اور باہمی کشمکش رونما ہے تحاسد و تنافس آپس
میں جاری ہے لتتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر باعا بباع الحدیث
اور جب سے کانگریس نے حکومت وقت سے آئینی جنگ شروع
کی ہے اور تشدد کو عدم تشدد کے پیرایہ میں سکھلانے کی بنیاد ڈالی
ہے اور انھیں اصول سے مقابلہ شروع کیا ہے جو آج کل یورپ
میں رائج ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس جنگ میں شرکت کی ہے اسوقت
سے تو اس وطنی و اشتراکی جنگ کے بہت ہی نمایاں اثرات مسلمانوں
کی اجتماعی و انفرادی زندگی میں رونما ہیں اور قوم نصاریٰ کے اصول
مجالس مایہ الافتخار سمجھے جانے لگے ہیں مثلاً لہو و لعب ایک مکروہ اور
ناجائز چیز ہے۔ نصرانیوں نے انہی کو اپنی اجتماعی زندگی میں جزو
معاشرت بنا کر آخر ایک ایسا مرتبہ دیدیا کہ آج سمجھائے سے بھی ان کی
کراہت و حرمت سمجھ میں نہیں آتی، یا مثلاً آج قیام مرکزیت کو استبداد
و مطلق العنانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ
حکومت کی مرکزیت کو فنا کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان کو برابر کا شریک
حکومت دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے راستہ بھی اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ
مرکزیت کے خلاف کے خوگر اور عادی ہو جائیں اور ہر سلسلہ کی مرکزیت میں
ان کی بیساختہ یہی تخریبی رفتار ہو علی ہذا جو لوگ مرکزیت موجودہ کے
حامی ہیں وہ جمہوریت و اشتراکیت کے مخالف ہوں غرض یورپ کے طرز مجالس
اور وضع و طریق سے آج نہ صرف رہنمایان ملک ہی متاثر ہیں بلکہ جو حضرات
اہل علم ان کے شریک حال ہو گئے ہیں وہ بھی مقاصد کلیہ میں مصروف و منہمک

ہونے کی وجہ سے بہت سے منکر خلاف شریعت غیر اسلامی طریقوں پر نکیر کو بھی
خلاف مصلحت قرار دیکر سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں اور پھر سکوت اُنکا انکے
نزدیک گو ازراہ دیانت ہی کیوں نہو لیکن نتیجہ بحیثیت مجموعی ان سب امور کا
یہی نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے مذہبی روح نکلتی چلی جارہی ہے
اور مذہب کی ضرورت و عظمت کم ہوتی جارہی ہے اور وطنیت و اشتراکیت
مقصود کے درجہ میں آگئی ہے اسلامی مرکزیت اور اسکی اجتماعی شان میں
علماً و عملاً یورپ کے دلفریب مگر تباہ کن جمہوریت کے معنے سرایت کرتے چلے
جارہے ہیں اسلام و اکابر اہلِ اسلام کی روایات اور ان کا نقشِ قدم علماً
وعملاً اقتصاداً و شرعاً فنا ہوتا جارہا ہے جو مقابلۂ اعداء کا طرز اسلام نے سکھلایا
تھا اب اس عنوان اسلامی میں غیر مسلم مقابلے کے طریقے تجویز کئے جارہے ہیں
گویا عنوان تو تعلیمات اسلام کا ہے مگر روح انکے اندر یورپ کی سما گئی ہے
اس لئے مناسب بلکہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مرکزیت و جمہوریت
کے عنوان کے ماتحت کچھ عرض کیا جائے میرے خیال میں یہ فریضۂ تحریر اب اہلِ علم
پر اسوجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدانخواستہ اگر مسلمانوں کی بحثوں اور انکی باہمی
کشمکش میں اصول اسلامی مشتبہ ہوگئے اسلام کی امارت عامہ یا امارت خاصہ کی
حیثیت غلط طور پر دلوں میں راسخ ہوگئی اور اسلامی مرکزیت میں اگر ہادیان
سیاست اور ماہران مغربیت کی بدولت اعتقاداً و علماً یورپ کی موجودہ دلفریب
مگر تباہ کن جمہوریت کے معنی سرایت کرگئے اور یہ لون جدید یونہی مسلمانوں کے
عوام و خواص میں بتدریج غیر محسوس طریقہ پر اپنا کام کرتا رہا تو یہ نہ صرف
مسلمانوں کے موجودہ و آئندہ نظامہائے دینی و دنیوی ہی کے لئے مخرب و مہلک

ہوگا بلکہ علمی اور اصولی حیثیت سے اس کا ضرر اصول اسلامی پر بھی یقیناً پڑے گا لہٰذا اس مسئلہ کی مختصر سی وضاحت کو ایک اہم فریضۂ دینی تصور کرتے ہوئے جس میں آج علماء کا ایک طبقہ بھی مبتلا ہے۔ اس مختصر سی تحریر سے ابتدار کی جاتی ہے۔ اس تحریر میں نہ کسی طبقہ پر طعن مقصود ہے نہ کسی جماعت کی حمایت، بلکہ اصولی حیثیت سے ایک تبصرہ ان مباحث پر کرنا ہے خواہ وہ کسی کے موافق ہو جائے۔ حق تعالےٰ ہم سب کے خیالات و افکار میں قبول حق کی توفیق و استعداد بخشے اور ہم کو اعجاب رائے نفسانیت و سخن پروری اور ما قال و من قال کی کج بحثیوں سے دور رکھے آمین۔

خاکسار

محمد طاہر بن احمد القاسمی کان اللہ لہٗ

۲۰ ربیع الاول ۵۴ھ

امیر و سرپرست کی شرعی عقلی عرفی حیثیت پر ایک مشترک تقریر

کثرت وحدت کے سانچہ میں

انتظام تکوینی کے جس شعبہ اور اس کے جس حصہ پر بھی غور کرو یہی نظر آتا ہے کہ وحدت بکثرت میں کثرت ہی کو وحدت کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہے اور وحدت ہی میں اختیار وقدرت ایسا ودیعت کیا گیا ہے جس سے کثرت سمٹ سمٹ کر وحدت کا رنگ اختیار کرلے چنانچہ اس عالم کون و فساد میں بھی جو نظام فطرت قائم ہے اس کا آخری ملجا اور منتہا خداوند عالم ہی ہے اگر ایک خدا کے بجائے دو خدا تسلیم کئے جاویں اور دونوں بااختیار یا دونوں مجبور یا ایک مجبور اور دوسرے کو بااختیار مانا جائے تو بیشک نظام عالم کے باقی رہنے اور اس عالم کے حسن و جمال کے قائم رہنے کی صورت نہ ہوگی لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا بلاشبہ اسی ایک حقیقت واقعیہ کا اظہار ہے۔

نظام وحدت کا رواج عالم انسانی میں

خداوند عالم جل ذکرہٗ نے اس نظام وحدت کو عالم انسانی میں بھی رائج فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری عز اسمہٗ ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۝

یعنی تمام کرۂ ارض کیلئے خداوند پاک نے اپنا ایک قائمقام بااختیار نائب اور خلیفہ پیدا کیا جسکو خود تعلیم و تربیت سے مشرف الہام فطری و کرامت عقل کے ذریعہ کائنات ارضی پر فوقیت بخشی۔

یہاں نہ کوئی جماعت حکمراں مراد لی جاسکتی ہے نہ کثرت کو حکمراں اور باختیار ہی کہا جاسکتا ہے بلکہ تمام عالم کے لئے ایک ہی خلیفہ تسلیم کرنا پڑیگا جس کے ثبوت میں آج ہر گھر میں ایک ہی بڑا ہوتا ہے، تمام بڑے نہیں ہوتے ہر قوم میں ایک ہی سرغنہ ہوتا ہے، ہر فرد سرغنہ نہیں ہوتا۔ الغرض جس طرح ہر گھر میں ایک ہی بڑا بن سکتا ہے بقیہ سب چھوٹے اسی ایک کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں اور جس طرح ہر ملک ہر قوم کے لئے ایک ہی زعیم اور ایک ہی سرنشار ہو سکتا ہے اور آخر میں تمام سلاسل کائنات اور تمام انتظامات عالم کا محور و مرکز ذات خداوندی ہی ہے۔ اسی طرح ہر کارخانہ اور ہر ادارہ و ہر انجمن میں ایک ہی شخص بااختیار روح رواں ہو سکتا ہے تمام اشخاص بوجہ تفاوت عقل و شعور اس مرتبہ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

جو نظم و مذہب وحدت کے مراتب طے نکرائے وہ نظم و مذہب حق نہیں ہو سکتا۔

اسی تقریر سے یہ نتیجہ بھی بآسانی نکل آتا ہے کہ جو نظم کثرت میں وحدت کو غالب نہ کر سکے یا جو مذہب وحدت کے کل مراتب کو طے نکرا سکے وہ نظم اور وہ مذہب بلاشبہ معیار فطری سے گرا ہوا ہوگا اور ہرگز اس کو صحیح مذہب اور صحیح نظام نہ کہہ سکیں گے۔

جیسے آفتاب عالمتاب کا وجود کارخانہ عالم کے لئے ضروری ہے اگر یہ نہوتا تو جملہ کاروبار معطل رہتے۔ اسی طرح عالم اسباب میں اگر کسی جماعت کسی قوم اور کسی نظم میں کوئی امیر یا سرپرست اور سلطان نہوتا تو کام نہ چل سکتا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ عالم اسباب کے لئے امیر و سلطان خلیفہ و حاکم سرپرست و سرغنہ کا وجود توأم (جڑواں) ہے تو بجا ہے اسلئے کہ عالم کو اختلاف لازم ہے

اور اس اختلاف کا منشار کثرت ہے اور کثرت میں سے اختلاف اسی وقت مٹ سکتا ہے جبکہ اس کے ایک سرے پر وحدت کو قائم کیا جائے اور دوسرے پر قانونِ الٰہی کو رکھا جائے اور ایک کو دوسرے سے پرکھا اور پہچانا جائے۔ لہٰذا مرکزیت کا (وجود) ایک لازمی اور فطری مسئلہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ امیر و سلطان ارتقائے نظم اور بام قوت کے اس آخری مرتبہ کا نام ہے جہاں کل قوتیں علمی و عملی جا کر مجتمع ہو جاتی ہیں۔

اختلاف کی سطح جسقدر مرتفع ہوگی اسی قدر امارت مرتفع ہوگی۔

اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختلاف کی سطح جسقدر مرتفع ہوگی اسی قدر امارت و وحدت کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی دیکھو ایک قصبہ کے لوگوں کے باہمی نزاعات و حقوق کے لئے اور ان کے اختلافات کو ایک مرکز پر قائم رکھنے کے لئے جیسے ایک تحصیلدار کافی ہوتا ہے ایسے ہی ایک ضلع کے مختلف قصبات کے انتظامات کیلئے ایک کلکٹر یا تعلقدار کافی ہوتا ہے ایک صوبہ کے اختلافات و نزاعات کو اپنی اپنی حد پر قائم رکھنے کے لئے گورنر رکھا جاتا ہے تو تمام ملک کے لئے ایک بادشاہ ایک امیر ایک وائسرائے ایک مربی و سرپرست مقرر کیا جاتا ہے اور اس طرح کثرت کو وحدت کے سانچہ میں ڈھال کر قدرت اپنی نیرنگی قدرت سے انسان کی عقلوں کو پرکھتی اور کثرت کے چکر میں توحید پرستوں کو آزماتی ہے۔ الٓمٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ایمان لا کر بغیر آزمائش کے چھوڑ دیئے جاویں گے بے شک اُن کی آزمائش کی شکل یہی ہو سکتی ہے۔

کہ ان کو ایک دوسرے کا تابع و متبوع بنایا جائے اور غلامی اور آزادی دونوں حالتوں میں جانچا جائے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ فتنہ بھی انہی صورتوں میں بڑھتا ہے جبکہ مرکزیت کاملہ نہو بالفاظ دیگر فتنہ و تشتت اسی صورت میں ہوگا جبکہ کثرت بلا وحدت ہو یا کثرت مع الوحدۃ ہو مگر وحدت غالبہ نہو۔ ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

حکم کا مرتبہ شخص واحد کیلئے ہے

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ	یعنی اے داؤد ہم نے تمکو زمین پر اپنا نائب بنایا ہے اس لئے تم پر لازم ہے کہ تم لوگوں کے درمیان انصاف اور عدل سے کام لو اور ہوا (خواہش نفس) پر نہ چلو کیونکہ یہ خدا کے راستہ کو گم کر دینے والی چیز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ اہل ہوی کا اتباع نکریں اگرچہ وہ عدد میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں بلکہ آپ اہل حق کے ساتھ مربوط رہیں خواہ وہ عدد میں کتنے ہی کم کیوں نہوں اس لئے کہ جس طرح نور آفتاب کو آئینہ کی طرح کوئی دوسری مخلوق صاف طریقہ پر قبول کرنے والی نہیں اسی طرح نور عقل کو بھی ہر ایک انسان قبول کرنے والا نہیں ہے۔

دیکھئے یہاں (اس آیت میں) حکم اور امر کا تعلق شخص واحد کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے کثرت کو اس کا اہل قرار نہیں دیا گیا کہ وہ حکم اور امر کا

مرتبہ اختیار کرے اسی لئے سلطان و امیر کا اتباع اور اس کی اطاعت تمام مسلمانوں پر تمام اعیان امت پر بلا استثنار تمام زعمار قوم پر اس وقت تک لازم اور ضروری ہے جب تک خدا و رسول سے ان کے احکام نہ ٹکرائیں اور یہ اس لئے حکم ہے کہ مسلمان وحدت کے سلسلہ میں جکڑ بند کر دیا گیا ہے لہٰذا اگر ادنیٰ سلسلہ کی مرکزیت اور وحدت انتہائی اور آخری مرتبہ کی مرکزیت و وحدت کے خلاف کوئی حکم دیتی ہے تو بیشک عقلاً یہی شعار مسلمین ہونا چاہیئے کہ وہ آخری مرکزیت کا لحاظ فرمائیں۔

آخری مرکزیت مطلقہ ہے

اسی لئے قرآن مجید میں ایک جانب اگر مسلمانوں کو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْل کا حکم دیا گیا اور مسلمان کے لئے دینی وحدت کا سامان مکمل کیا گیا تو دوسری طرف اولی الامر کی اطاعت بھی فرض کے درجہ میں رکھی گئی ہاں مگر جہاں اطاعت کا یہاں تک سبق دیا گیا کہ اگر تم پر ایک کنکٹے عبد حبشی کو بھی امیر مقرر کر دیا جائے تو تم اس کی اطاعت کرو وہیں دوسری طرف حدیث میں یہ بھی فرما دیا گیا۔ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

اختیار و تقیید مطلق اور انکا نقطۂ اجتماع

لیکن نظام انسانی اور نظام خداوندی میں چونکہ ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا جیسا مختار ہے بندہ ویسا مختار کل نہیں ہے وہ خالق ہے تو یہ مخلوق ہے وہ اپنے انتظام تکوینی میں کسی کا محتاج نہیں ہے اور بندہ اپنے انتظامات میں دوسروں کا محتاج ہے اس کے پاس نور عقل کے ساتھ غفلت و نسیان بھی ہے اور خدا کے یہاں اُن میں سے کسی کا گذر نہیں

ہے اس لئے اختیار مطلق اور تقید مطلق میں ایک ایسا بین بین راستہ پیدا ہونے کی فطرتاً ضرورت تھی جو نظام انسانی کو نظام خداوندی کے ہم رنگ بھی بنا دے اور انسان کو غفلت و نسیان غلطی و گمراہی سے بچائے (رکھے) اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مزاج خلافت آلہی کے سب سے اوّل مستحق اور سب سے آخر میں مظہر ہوئے ہیں ارشاد ہوا :۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	یعنی جو حکم آپ اپنے متبعین کو فرمائیں قبل از اظہار حکم اخیار امت سے مشورہ فرمالیا کیجئے تاکہ جس معاملہ میں جو حکم بھی ہو وہ علی وجہ البصیرت ہو

اور امور تصفیہ طلب کے تمام پہلو اور اس کی ہر جانب کی مشکلات و معضلات منافع و مضار کو آپ کے مخلصین و جان نثار دماغی کاوشیں فرما کر بحیثیت مجموعی بیک وقت منقح طور پر آپ کے سامنے واضح کر دیں اور آپ کو پھر خشیۃ الٰہی کے ماتحت ایک جانب معین کرنے میں شرح صدر ہو جائے اور مرتبہ حکم وامر پر پہنچ جانا سہل ہو جائے ۔

مشورہ انبیاء کیلئے بھی لازم کیا گیا

بہرحال دنیا کے معاملات ہوں یا دین کے مشورہ ہر انسان کیلئے لازم ہے اور اس سے انبیاء تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے چنانچہ علاوہ واقعات نبوی کلہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے واقعہ ذبح اسمٰعیل علیہ السلام کو سامنے رکھ لیجئے تو اس سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے حضرت ابراہیمؑ کو جب خواب میں یہ اشارہ غیبی ہوا کہ وہ اپنے وعدہ کا ایفاء کریں اور اپنے اکلوتے بیٹے کو راہ خداوندی میں قربان کر دیں تو انھوں نے حضرت اسمٰعیلؑ

سے فرمایا۔ یَا بُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھکو (خدا کی راہ میں) قربان کر رہا ہوں اس میں تیری کیا خواہش ہے، حضرت اسمٰعیلؑ باوجود کبیر السن نہونیکے جامع اور مختصر جواب یہ دیتے ہیں اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ یعنی آپکو جس بات کا حکم دیا گیا ہے آپ اسے ضرور کیجئے انشاء اللہ آپ مجھے صابرین ہی میں سے پائینگے یعنی آپ جو بھی حکم الٰہی کے موافق میرے ساتھ معاملہ فرمائیں گے اس میں آپ مجھے ذرا بھی کٹ حجتی کرنیوالا نہ دیکھیں گے۔ غالباً حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نظر اس پر تھی کہ نبی کا خواب بھی چونکہ بیداری کے واقعہ کے برابر ہی ہوتا ہے اور وحی الٰہی ان دونوں کیفیتوں میں سے جس کیفیت میں بھی آئے وہ صادق و مصدوق ہی ہوتی ہے اس لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے جواب کا منشاء اصلی یہ تھا کہ اے خلیفۂ خداوندی امر رب اس زمانہ میں اگر براہِ راست کسی پر نازل ہو سکتا ہے تو وہ ایک ذات مقدس آپ کی ہی ہے اس لئے دیر کیا ہے ضرور مجھے راہ خدا میں قربان کیجئے جو بیشک میرے لئے حیاتِ ابدی کا پیش خیمہ ہے۔

دیکھئے اس موقع پر بھی نبی نے حکمِ خداوندی کی تعمیل سے قبل اپنے صغیر السن مخاطب سے مشورہ کیا۔ یہ رازِ الٰہی ایسا تو تھا نہیں کہ ہر کس و ناکس سے اس بارہ میں مشورہ لیا جاتا اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے باوجود مرتبہ میں بڑے ہونے کے پھر بھی اپنے صغیر السن بیٹے سے مشورہ کیا اور اس کے بعد امرِ خداوندی بجالائے۔

معلوم ہوا کہ مشورہ کے لئے اتحاد خیال و اتحاد قلب کی بھی ضرورت ہے

اگر اہل مشورہ میں اتحاد مسلک و اتحاد قلبی نہو تو بیشک وہ مشورہ صحیح نتائج برآمد نکر سکے گا۔ ان امور پر نظر کرنے سے صاف طور سے واضح ہوتا ہے کہ مشورہ ہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو باہم نتائج صحیحہ پر جمع کرتا اور گم کردہ راہ لوگوں کو راہ راست پر لانے والا ہے اور ہر مسئلہ غامضہ کے تمام جوانب مخفیہ کو کھولنے والا ہے اور یہی ایک چیز ایسی ہے جو مشکلات و معضلات میں پھنس جانے والوں کو ان سے نجات دلانے والی ہے جیسے وحی والہام ربانی سے انسان کی عقل میں جودت اور رسائی پیدا ہوتی ہے۔

مخلصانہ مشورہ سے سرخداوندی آشکارا ہوتا ہے

اسی طرح اہل دانش و اخلاص کی مجموعی مشاورت سے سرخداوندی آشکارا ہوا کرتا ہے جیسے دانہ گندم اسی وقت زمین سے برآمد ہوتا ہے جب ہاتھ پیروں سے محنت کی جائے لوازمات نباتات کو مہیا کیا جائے۔ اسی طرح سرخداوندی بھی مشکلات و معضلات سے اسی وقت ہویدا ہوتا ہے جبکہ ارباب یقین و ایمان کامل العقل والدین متدین و فہیم اہل دانش و فراست باہم بحث و تمحیص غور و تعمق کرکے اپنی دماغی کاوشوں سے اپنے اوپر محنت و تعب برداشت فرمادیں۔

ہاں مگر اسی کے ساتھ سرخداوندی کے آشکارا ہونیکی اولین شرط یہ ہے جیساکہ اوپر اشارہ کیا جاچکا کہ مشیر باہم متحد المشرب کامل العقل نیک نیت ایک دوسرے کے سچے ہمدرد ہوں لیکن اگر مشیر متعدد ہوں مگر آپس میں تنافس اور تحاسد رکھتے ہوں یا خلاف و اختلاف ذاتیات تک پہنچ چکا ہو یا مثلاً مشیر نیک نیت اور کامل العقل نہوں تو ایسی شکلوں میں بیشک بجز مشاجرت

ومنازعت ومنافرت کی زیادتی کے کوئی نتیجہ صحیح برآمد نہو سکے گا۔

وحدت نظم وحدت فکر اور وحدت عمل بہرحال نتیجہ صحیح اسی کو کہتے ہیں جس سے نقطہ معتدل پر سب جمع ہو جائیں، یعنی کثرت صالحین میں وحدت مسنونہ پیدا ہو جائے پس تم خود سمجھ لو کہ دنیا میں اس قوم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جس کے نظم میں وحدت ہو جس کے فکر میں وحدت ہو جس کے علم میں وحدت ہو اور جس کے عمل میں وحدت ہو جسکی دین و دنیا میں وحدت ہو۔ ہمارے خیال میں کثرت و قلت کا سوال ہی اسلام میں نہیں ہے اور بیشک یہ سوال ہی اسوقت اٹھ سکتا ہے جبکہ مشیروں میں اتحاد مشرب کو ضروری خیال نہ کیا جائے بلکہ مروجہ طرز جمہوریت کی رو سے متضاد طبائع اور مختلف خیال کے لوگ ایک سطح پر کھڑے کئے جاویں پھر انتخاب کا کوئی معیار صحیح مقرر ہو نہ اوصاف باطنی مدنظر ہوں[1] بلکہ ہم تو ترقی کر کے یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں کثرت رائے اور قلت رائے کا سوال ہی اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ امیر اسلام وخلیفہ اسلام کا وجود اور اسکی اطاعت کا انکار کر دیا جائے، اس لئے کہ جب باگ ڈور اسلام نے ایک شخص کے ہاتھ میں دیدی اور اس کے ہاتھ میں کتاب اللہ کو دیدیا گیا اور مشورہ لینے کا اسکو پابند کر دیا گیا اس کے ساتھ عمل میں اس کو مختار کر دیا گیا تو پھر بداہتہً یہ حقیقت کالشمس فی النہار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں کثرت و قلت آراء کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور ایک نظیر بھی ایسی نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا آپ کے خلفاء راشدین نے مشورہ لینے کے بعد

---

[1] اور ایسی شکلوں میں بیشک مشیر کثرت و قلت کی بحثوں میں وقت ضائع کریں گے۔

رائے شماری کی ہو یا کثرت و قلت پر نظر کی ہو اسلام کیا ہے اطاعت اولی الامر ہے ولو امر علیکم عبد حبشی مجدع الاطراف اس کی اطاعت واجب ہے مگر جبتک کہ اس کے احکام کتاب منزل من اللہ سے نہ ٹکرائیں اس کو توازن آراء کی شکل میں ہی ترجیح کا حق نہیں دیا گیا ہے بلکہ مشورہ صلحاء کے بعد عزم خلیفہ ہی پر تمام سعادتوں کو دائر فرما دیا گیا ہے۔

کثرت رائے کا اصول قرآن مجید میں نہیں

بہت بڑا ثبوت ہمارے دعویٰ کا یہ ہے کہ اسلام میں اگر فیصلہ کثرت رائے پر ہوا کرتا تو کتاب و سنت میں ضرور اس کے قواعد اور کلئے موجود ہوتے رائے شماری کے طریقے بتلائے جاتے کاسٹنگ ووٹ کی صراحت ہوتی ان کی تفصیل و توضیح فقہاء اسلام فرماتے جنہوں نے بال کی کھال ہر ہر مسئلہ میں نکالی ہے ناممکن تھا اس کے متعلق کوئی بحث مدون نفرماتے اور جو کچھ جزیے اس قسم کے ہیں بھی تو بدقسمتی سے وہ ہمارے دلدادگان مغرب کیخلاف ہیں اسلام ایک دین کامل ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے انسان کی کسی زندگی کے شعبے کی کوئی ضرورت ایسی نہیں چھوڑی جسکی رہنمائی نہ کی ہو۔ سو اگر کثرت رائے مدار کار ہوتی اور یہی اسلام کا شعار ہوتا۔ تو ضرور اس قسم کی احادیث و آیات موجود ہوتیں۔

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے

اسلام کی بنیاد چونکہ توحید پر ہے اس لئے اسنے اسی قسم کا نظام قائم کیا ہے جسمیں طول امل کثرت کار سے اجتناب ہو قواعد کی بھرمار نہو۔ یہی وجہ ہے کہ اطاعت امیر کا وجوب ایک ایسا مختصر زرین اصول اسلام نے تلقین کر دیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

ایک ایسی شمع فکر ہاتھ میں دیدی کہ اگر کتاب اللہ اور عترت نبوی علیہم السلام کو مضبوطی سے تھام کر اپنا نظام قائم کیا جائے تو کوئی دنیا کا نظام بھی اسکی تاب نہ لاسکے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ سے ان مومنین سے حق تعالےٰ نے اپنی رضا کا اظہار فرمایا جنھوں نے ایک درخت کے نیچے اس کے مقدس رسول کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر وحدت کو اختیار کرتے ہوئے تمام قواعد و قوانین کو ایک طرف رکھدیا۔

غرض اسلام میں یا اجماع امت ہے یا اطاعت امیر ہے سو اجماع امت بھی بیشتر اطاعت امیر ہی کے انعقاد و استحکام کے لئے ہے۔

بحالتِ غلبہ و مغلوبیت اسلام کی تعلیم دربارہ قیام امارت

لیکن اہل اسلام کے احوال زمانے کے احوال کے ساتھ چونکہ خود بدلتے سدلتے بھی رہتے ہیں کبھی حاکم ہیں تو کبھی محکوم کبھی قیام امارت سے قاصر ہیں کبھی اس پر قادر اس لئے بحالت غلبہ اگر اطاعت اولی الامر کا حکم دیا تو بحالت مغلوبیت اتباع سواد اعظم کا حکم دیا یعنی جب امیر عام نہو، اور تمہارا شیرازہ منتشر ہو کوئی تمہیں صحیح راہ پر لگانیوالا نہو تو غالب کا رجحان جس طرف ہو اسی کا تم بھی اتباع کرو۔ لیکن اتباع سواد اعظم سے کثرت رائے کی حقانیت واضح کرنا یہ خوش فہموں ہی کا کام ہوسکتا ہے علاوہ ازیں دنیا میں جس قسم کا نظام بھی انسان بناتے ہیں مقصد اس نظام کے قائم کرنے سے انکا یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنظمی پر غالب ہوکر خود مختار ہوں۔ اور فتح و نصرت سے ہمکنار ہوں

فتح و نصرت کا مدار کثرت پر نہیں ہے

لیکن فتح و نصرت کامیابی و غلبہ جسکا

بظاہر بہت گہرا تعلق کثرت پر ہے حق تعالےٰ نے اس کو بھی محض کثرت ہی پر محمول نہیں فرمایا بلکہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ سے طبائع سلیمہ کو یہ فطری سبق پڑھادیا کہ غلبہ و نصرت کثرت و قلت پر موقوف ہی نہیں ہے بلکہ غالب اور مغلوب فرمانیوالا اور اسباب غلبہ کو مغلوبیت سے اور اسباب مغلوبیت کو اسباب غلبہ سے بدلنے سدلنے والا صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی ہے اور ایک ہی ذات واجب الوجود ایسی ہے جس نے کبھی باوجود اہل حق کی تعداد کثیر کے انکو کفار سے مغلوب کرادیا اور کبھی مٹھی بھر مسلمانوں سے کفار کے لشکر جرار کو زیروزبر کرادیا۔

ذات خداوندی ہی اختلاف عالم میں حکم حقیقی ہے

غرض وہی ایک ذات احکم الحاکمین اختلافات عالم میں حقیقی حکم اور موجب عدل ہے جو دنیا کی کثیر آبادی میں سے جس کو بھی حق پر دیکھتا ہے اُسیکو دائمی فتح و ظفر سے ہمکنار فرماتا ہے اور کبھی قلت کو کثرت پر اسی لئے ترجیح دیتا ہے کہ قلت میں طبعی طور پر بہ نسبت کثرت کے زیادہ نظم و استحکام ہوتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ عالم میں اہلِ اسلام و اہلِ کفر کے موجود ہوتے ہوئے اہلِ اسلام کو تعداد میں بہ نسبت کفار کے زیادہ نہ رکھا گیا اور ہمیشہ حق و صداقت کا آفتاب مٹھی بھر انسانوں کے ہی ذریعہ چمکایا گیا تاکہ کثرت و قلت وحدت و اکثریت کے جال میں پھنس جانیوالے اس کو بخوبی سمجھ لیں کہ حق تعالےٰ فتح و ظفر سے جس کو ہمکنار فرماتا ہے، اس کو پہلے مصائب کی گھاٹیوں سے گذار کر یکہ و تنہا فرما کر دنیا کو اس کے بالمقابل کھڑا کر دیتا ہے۔ تاکہ اہلِ ظاہر و اہلِ بصیرت کا اس طرح امتحان ہو جائے۔

نظام کثرت وقلت میں ترجیح خداوندی

یہی وہ نظام کثرت وقلت ہے جس میں ترجیح حضرت حق جل مجدہٗ نے اپنے اذن کے ساتھ دی ہے یعنی جنھوں نے عالم میں کثرت واختلاف سے کنارہ کشی کرتے ہوئے مرکزیت عالم کو عملاً وعلماً قائم کیا اور بیعت رسول سے مرکزیت اسلامی قائم کرتے ہوئے اطاعت وانقیاد کو زندگی کے ہر سلسلہ میں زندہ ونمایاں کیا انہی سے اللہ راضی ہوا اور ایسی ہی جماعت حقہ کے متعلق ید اللہ فوق ایدیھم اور ید اللہ علی الجماعۃ فرمایا گیا جس سے ظاہر فرمادیا گیا کہ جس جماعت حقہ نے مرکزیت عالم کو قائم کرنے کے لئے اتباع رسول وانقیاد نبوی اور وحدت اسلامی کا ثبوت دیا ہے عالم کے محور ومرکز ذات وحدہٗ لاشریک کا ید مہر بھی اسی جماعت حقہ پر مبذول کرم اور واہوگا اور بیشک ایسی ہی جماعت کو سب سے اعلیٰ مرکزیت حاصل ہوجائے گی۔

اطاعت امیر اور اطاعت خدا ورسول کے مراتب

اور بیشک ایسی ہی جماعت کبھی ضلالت پر مجتمع نہوگی کیونکہ اس جماعت حقہ نے وحدت کے تین مرتبے اپنے علم اور عمل میں قائم کررکھے ہیں (۱) پہلا درجہ وحدت اطیعوا اللہ سے قائم کیا ہے دوسرا اطیعوا الرسول سے تیسرا اولی الامر منکم سے۔

بیشک ایسی جماعت حقہ اور سواد اعظم کا اتباع مسلمانوں پر لازمی ہے۔ جس کے یہاں علماً وعملاً مرکزیت عالم کا قیام ضروری ہے اور جو اپنے دائرۂ عمل میں اتباع وانقیاد خدا ورسول کو ایک جزو لاینفک سمجھتی ہے کما اشار بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اتبعوا السواد الاعظم لا یجتمع امتی علی الضلالۃ

لایزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خالفھم
وقال تعالٰی فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین
ولینذروا قومھم

جن کا سب کا حاصل وہی ایک ہے یعنی امت مسلمہ میں سے ایک قلیل جماعت ہی ایسی ہوگی جو گو عدد میں قلیل ہوگی مگر اپنی قوت دلیل اور قوت عقل ودین میں غالب ہوگی اور خلاف کرنے والوں کی یورشیں ان کو اپنے ارادوں میں ڈگمگا نہ سکیں گی۔

غرض ان احادیث سے جہاں اشارۃً یہ امر ثابت ہوجاتا ہے کہ (اُمت مسلمہ تمام عالم کا خلاصہ ہے) وہیں یہ امر بھی پوری طرح واضح ہے کہ تمام امت مسلمہ میں سے بھی حق پر قائم رہنے والا ایک ہی طائفہ ہوگا، جس کا مسلمانوں کو اتباع وانقیاد لازمی ہے، کیونکہ وہ خود بحیثیت مجموعی مرکزیت کو قائم کرنے والے ہیں۔ اور ان کا ہر ہر فرد اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مرکزیت کا قائم رکھنے والا ہے۔

جماعت صحابہ مقتدائے مسلمین ہے اور اسکے ہادی خلفاء رسول ہیں

غرض جماعت صحابہ کا اقتدا مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے تو جماعت صحابہ پر اتباع رسول اور اطاعت خلفاء رسول کو لازم کیا گیا ہے وقس علی ھذا پس جو لوگ جماعت حقہ کے اتباع سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہیئت حاکمہ ایک جماعت ہونی چاہیئے ایک فرد نہ ہونا چاہیئے ان کو اس پر نظر کرنی چاہیئے کہ اس جماعت کا امیر وحاکم بھی تو ایک ہی ذات کو بنایا گیا ہے جس کو مروجہ مجالس کی طرح محض

کاسٹنگ ووٹ کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اختیارات تام اس کو حاصل ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو و جان و مال سب ہی اس کے قبضہ میں دیدی جاتی ہیں۔

خواص کی اصلاح بذمہ امیر ہے اور یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ اگر عوام کی اصلاح کا بار خواص پر ہو تو خواص کی نگہداشت اور ان کے باہمی اختلافات کو اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے ایک امیر محکم القول ہونا چاہیئے اس مقام پر پہنچکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند نظائر شرعیہ بھی ایسے پیش کر دئے جائیں جن سے واضح ہو جائے کہ قرون اولیٰ میں کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار نہ تھا بلکہ فیصلہ امیر ہی کی رائے پر محمول ہوتا تھا تاکہ اگر مسلمان اس دور جمہوریت میں نظام اسلامی کو قائم کرنا چاہیں تو انہیں آسانی ہو۔

چند نظائر شرعیہ

قضائے قاضی (۱) اس بارہ میں سب سے پہلی چیز جو ہماری غور و فکر میں بصیرت پیدا کرنے والی چیز ہے وہ مسئلہ قضائے قاضی ہے۔ قضائے قاضی اس وقت نافذ اور جاری ہوتی ہے جب افراد و اشخاص میں باہم کوئی نزاع یا اختلاف واقع ہو جائے مثلاً ایک معاملہ میں اگر ایک شخص تنہا ایک طرف ہو اور دوسری جانب متعدد افراد و اشخاص ہوں لیکن واقعات و دلائل اس ایک شخص کے ساتھ ہوں تو شریعت اسلام کا حکم یہ ہے کہ عدل اور حق پر فیصلہ دیا جائے یہاں کثرت و قلت کا کوئی سوال نہیں ہے

اور فیصلہ صرف ایک ہی شخص کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے یہ نہیں کیا گیا کہ چند آدمیوں کی جماعت کو قضاء کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔

امارت سفر

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جب تم چند آدمی کسی جگہ کا سفر کرو تو آپس میں ایک کو اپنا امیر بنالو اور سفر کے جملہ امور اسی کے رائے اور مشورہ سے کیا کرو۔ دیکھئے اس حکم سے بھی صاف طور پر واضح ہے کہ دینی معاملات ہوں یا دنیوی شریعت اور شارع علیہ السلام نے وحدت و امارت عامہ و خاصہ کو کس درجہ ضروری خیال کیا ہے۔

امارت امامت صلوٰۃ

(۳) تیسری چیز وہ ہے جس کا روزمرہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں یعنی نماز میں امام کی متابعت اس میں بھی مسلمانوں کو امر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں ایک شخص کو قائد بنادیں اور جو دین کا سچا قائد ہو اسی کو دنیا کے معاملات میں بھی قائد و رہبر بنادیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت و امارت کا بڑا سبب یہی نماز کی امامت تھی۔

واقعہ جنگ بدر اور آنحضرت کا فیصلہ

(۴) غزوۂ بدر میں ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور اسیر ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں صحابہ سے رائے طلب کی کہ آیا ان کو قتل کیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ فدیہ لیکر رہا کر دیا جائے شاید کسی وقت اسلام کے اس احسان کا ان پر

اثر ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے اس جانب تھی کہ ان سب کو قتل کردیا جائے۔ کیونکہ یہی لوگ کفر و شرک کے سرغنہ ہیں ان کے قتل سے لوگوں پر واضح ہوجائے گا کہ ہم نے خدا کے راستہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کا بھی کچھ لحاظ نہیں کیا ہے اور دوسروں کو اس سے ایک عبرت بھی ہوگی اور وقت کا اقتضا بھی یہی ہے۔ لیکن حضور اپنی طبعی رافت و رحمت کی وجہ سے اسی جانب مائل تھے کہ یہ قیدی چھوڑ دیئے جاویں اور صحابہ کی اکثریت بھی اسی جانب تھی۔ چنانچہ حضور نے یہی فیصلہ فرما دیا۔ لیکن حق تعالیٰ کے علم محیط میں چونکہ وہی امر پسندیدہ تھا جو حضرت عمر کی رائے تھی اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ الخ	نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں جبتک کہ وہ اچھی طرح زمین میں خونریزی نہ کریں تم دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت کو چاہتے ہیں۔

فیصلۂ شرعی کا مدار کثرت پر نہیں ہے

آیۃ ہذا سے صاف صاف عیاں ہے کہ فیصلہ کا مدار کثرت و قلت پر حق تعالیٰ کے یہاں نہیں ہے بلکہ اصابت رائے اور قوت دلیل پر ہے خواہ وہ اکثریت میں ہو یا اقلیت میں اور نافذ الامر خلیفہ و امیر ہی ہوسکتا ہے اور کوئی نہیں اور کثرت رائے حق کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں کیونکہ فاحکم بین الناس بالحق فرمایا گیا بالکثرۃ نہ فرمایا گیا۔

(۵) اسی سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت شیخین کے متعلق

یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دونوں اس بارہ میں متفق ہوتے تو میں تمہارا خلاف نکرتا اس ارشاد نبوی سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خلاف کرنے کا حق تو حضور کو حاصل تھا۔ مگر آپ نے اپنے قصد و اختیار سے ایسا فرمایا۔ نیز یہ بھی کہ اگر جمہور صحابہ ایک جانب ہوتے اور یہ دونوں حضرات ایک جانب ہوتے تو آنحضرت کثرت کا لحاظ نفرماتے بلکہ انہی کی آراء پر فیصلہ فرما دیتے۔

غزوہ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

(۶) غزوۂ اُحد میں جبکہ کفار مکہ کا لشکر مدینہ طیبہ کے قریب آپہنچا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا اور مشورہ فرمایا اس مشورہ میں بھی اختلاف رائے ہوا بعضوں کی رائے تھی کہ مسلمانوں کا لشکر مدینہ سے نہ نکلے بعض کا خیال تھا کہ ہمیں ڈٹ کر باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مختلف آراء کو سنکر گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہنکر باہر تشریف لائے اور آپ کی رائے مبارک بھی اس جانب ہوگئی کہ مدینہ سے باہر نکل کر ہی جنگ ہونی چاہیئے لیکن جب بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہمنے اصرار کرکے حضور کی رائے مبارک کو اپنی طرف مائل کیا ہے یہ مناسب نہ تھا اور پھر ان کی رائے بھی یہی ہوگئی کہ مدینہ کے اندر رہ کر ہی مقاتلہ کیا جائے گویا سب صحابہ کا متفقہ آخری فیصلہ یہی ہوگیا اور سب ایک زبان ہو گئے تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ نبی کے لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے تو اس سے پہلے کہ خدا اپنے رسول اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ نفرمادے اپنی زرہ کو نکالدے۔

اس مجمع مشاورۃ کے ہر پہلو پر بھی نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کثرت وقلت کا کوئی سوال ہی قرون اولیٰ میں نہ تھا بلکہ فیصلہ ایک ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا نیز صحابہ کا متفقہ فیصلہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم مبارک کے سامنے تاب نہ لاسکتا تھا اور جب یہ اُسوہ بنی ہوا تو بیشک نظامہائے مابعد میں ہر مطاع ومطیع کے لئے نیز خلفاء وامراء عادل کے لئے یہی اسوہ ہونا چاہیئے اور بلاشبہ خلافت راشدہ میں یہی طریق عمل جاری رہا اور قیامت تک ایسے ہی نظام کو محمود ومستحسن کہیں گے اس کے خلاف جو بھی نظام ہوگا اگرچہ وہ مباح اور جائز ہو مگر فطرت کی تمام خوبیاں اس میں نہ موجود ہوں گی۔

خلافت راشدہ کے چند نظائر

(۷) یہ تو عہد نبوی کے چند واقعات تھے جنسے ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ کی خوشنودی اور رضا اسی میں تھی کہ جو ایک مرتبہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو وہ حضور کے احکام کا پابند اور آپ کو رائے حق دینے میں کاہل نہو مگر عہد رسالت کے بعد خلفاء راشدین میں بھی یہی طرز عمل رہا بطور نمونہ ایک دو واقعات اس عہد کے بھی پیش کرتا ہوں۔

واقعہ ارتداد اور حضرت صدیق اکبر کا سب کے خلاف فیصلہ۔

(۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبائل میں ارتداد کی مسموم ہوا پھیلی اور منعدی ہونے لگی جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنی چھوڑ دی حضرت صدیق اکبر نے اعیان صحابہ کو جمع فرمایا اور مشورہ کیا افضل صحابہ اور تمام حضرات مہاجرین اس جانب

تھے کہ اس وقت مصلحت کا اقتضاء یہ ہے کہ کوئی تعرض نکیا جائے بلکہ سکوت ہی کیا جائے ——— تمام آراء کو سنکر حضرت صدیق اکبر نے ایک بے مثل تقریر فرمائی جو تمام ارکانِ مجلس صحابہ کے خلاف تھی حاصل اس کا یہی تھا کہ خدا کی قسم میں برابر امرِ الٰہی کو قائم رکھوں گا اور اسی پر قائم رہوں گا اور ایک رسی کے نہ دینے پر بھی جہاد کروں گا یہاں تک کہ میں مارا جاؤں اور پھر اسی پر بس نفرمایا۔ بلکہ عزم جہاد فرما کر آپ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے خلیفۂ رسول آپ کیا غضب فرما رہے ہیں اگر خدانکردہ آپ ہم میں نہ ہوئے تو آپ کا جبر نقصان ہمیں میسر نہ ہوگا۔ گھوڑے کی باگ تھام لی اور فرمایا کہ اگر آپ کی یہی رائے ہے تو ہم اُسکے لئے موجود ہیں خدا کے لئے آپ ٹھیریں چنانچہ پھر حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک لشکر مرتب ہوکر مرتدین کی طرف روانہ کیا گیا۔ یہ واقعہ اس قدر صاف و صریح ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی۔

خلیفہ وقت نے مشورہ لیا۔ لیکن عمل اسی پر کیا جس پر کہ اُس کو شرح صدر ہوا اور کسی صحابی نے یہ نہ فرمایا کہ متفقہ یا اکثریت کے فیصلہ کے توڑنے کا آپ کو حق حاصل نہیں ہے۔

روانگی شام اور حضرت فاروق اعظم کا آخری حکم

(۹) عہد فاروقی میں بھی نظام شوریٰ اسی نہج پر قائم تھا، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف روانہ ہوئے اور شام کے قریب پہنچ گئے تو شام کے اسلامی حکام اور فوجی سردار خلیفۂ رسول سے بمقام سُرغ ملے اور خبر دی کہ آج کل شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی

ہے۔ یہ خبر سنکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اولین کو جمع کیا اور وبا کی خبر سنا کر مشورہ طلب کیا اس میں اختلاف رائے پیش آیا بعض حضرات نے تو عرض کیا کہ آپ خدا کے دین کی حفاظت کے لئے نکلے ہیں خدا آپ کا محافظ ہے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ واپس ہوں، اور بعض نے کہا کہ آپ کے ساتھ خدا کی ایک عظیم مخلوق ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ آپ سب کو وبا کی نذر فرمادیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نہ قلت کو دیکھا نہ کثرت کو نہ رائے شماری فرمائی بلکہ سب کو رخصت فرمادیا پھر انصار کو جمع کیا اور ان سے اسی بارہ میں مشورہ طلب کیا اون میں بھی اختلاف ہوا ان کو بھی آپ نے فرمایا قوموا عنی اور اسی طرح رخصت کردیا۔ پھر سن رسیدہ قریشی مہاجرین کو جمع کیا اور رائے دریافت کی انھوں نے ایک زبان ہوکر کہا کہ ہماری رائے یہ ہے کہ آپ واپس ہی ہوجاویں تو بہتر ہے یہ سنکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکر میں واپسی کا اعلان فرمادیا۔

اس واقعہ سے بھی صاف عیاں ہے کہ عہد فاروقی میں بھی فیصلہ کن رائے امیر وخلیفہ ہی کی ہوتی تھی اور اسلام میں کثرت وقلت کا لحاظ نہ تھا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ متفقہ فیصلہ کا احترام حضرت عمر نے ضرور فرمایا ہے مگر پابند اس کے بھی نہ تھے اس کے برخلاف بھی کرنیکا حق اسلام نے پوری طرح دے رکھا تھا۔ چنانچہ بارہا انھوں نے ایسا کیا۔

مدار حکم وعمل خلیفہ وامیر ہوتا ہے

الحاصل ایک طرف تو اسلام نے حکم وامر کا مرتبہ شخص واحد کو دیا ہے۔ اور اسنے مدار فکر وعمل امیر وسرپرست خلیفہ وسلطان عادل کو قرار دیا ہے پورا ذمہ دار

پورا با اختیار اسلام نے ایک ہی ذات کو مانا ہے اور دوسری طرف اسلام نے امیر کو اختیار امت سے مشورہ کا پابند کیا ہے۔

موجودہ جمہوریت اور اسلامیت کا فرق

پس ان ہر دو امور کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے کہ موجودہ جمہوریت اور موجودہ ملوکیت میں یہ اسلامیت پائی جاتی ہے یا نہیں اور آج اگر کسی نظام اسلامی میں کسی کو مختار کل بنا دیا جاتا ہے تو اس پر استبداد کے جو لعن و طعن ہوتے ہیں ان کا منشاء نظام اسلامی سے واقفیت ہے یا ناواقفیت سو ایک طرف تو ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ جمہوریت پسند طبقہ بلا لحاظ اہلیت مشورہ ایک جماعت کو مشورہ کا اہل قرار دیکر انکی کثرت آراء کو واجب العمل قرار دیدیتا ہے جس میں بسا اوقات خلاف حق امور فیصل ہوتے ہیں اور اغراض کے تصادم اور اسکے پیچ و خم بسا اوقات باخبر اور بے خبر اہل مشورہ کو ایک صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اور یہ غلط انتخابات غلط نتائج پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور دوسری جانب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ امراء و سلاطین یا تو محض خوشنمائی کیلئے نام کی بادشاہت کر رہے ہیں اور یا بدون مشورہ صائب جو جی میں آتا ہے وہ کر لیا کرتے ہیں اور احکام نادری صادر کرتے ہیں گویا ایک طبقہ تو وہ درجہ اختیار کئے ہوئے ہے جو مرتبہ خدا کے حکم کا ہے کہ جو چاہے کر لیں اور دوسرا طبقہ وہ رنگ اختیار کئے ہوئے ہے جس میں اغراض نفسانی و مکائد شیطانی امور واقعیہ کے خلاف انسان کو چلا دیتے ہیں ایک طرف ملوک و سلاطین کا حد اعتدال سے تجاوز خرابی کا باعث ہے تو دوسری طرف قوم محکوم کا نافرمانی کی حد پر اتر آنا اور محکوم کو حاکم اور حاکم کو محکوم بنا دینے کی طرح اسے جمہوریت کے پردہ میں ڈال دینا بھی ہلاکت کا موجب ہے۔

امیر مشورہ صلاح نہ لے تو یہ ملوکیت ہے

اس لئے ہمارے نزدیک اگر بادشاہ و

امیر سرپرست و سلطان عادل اہل حل وعقد سے مشورہ نہ لیں تو اس کا نام ملوکیت و استبداد ہے۔

امیر کو با اختیار نہ رکھا جائے یہ آجکل کی جمہوریت ہے

اور اگر قوم محکوم میں مطلق العنانی پیدا ہو جائے۔ آزادی و خود اعتمادی خود رائی و خود پرستی آجائے یعنی ان کی کثرت تو با اختیار و با اقتدار ہو اور امیر و حاکم ان کا مجبور محض ہو اور محض کاسٹنگ ووٹ سے اس کا مجبورانہ تفوق ظاہر کیا جائے تو اس کا نام جمہوریت ہے اور بیشک یہ دونوں صورتیں فطری انتظام کی مسخ شدہ صورتیں ہیں۔

عقل و حکمت اور سفاہت و بلادت کی کشمکش میں حکم کی ضرورت ہے

علاوہ ازیں آپ ذرا اسکے دوسرے پہلو پر بھی تو غور فرمائیں کہ جبکہ آدمی باوجود صاحب عقل و حکمت ہونے کے بالطبع تنہا رہنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اکیلا وہ اپنی انسانیت کو باقی رکھ سکتا ہے نہ ہی سامان حیات فراہم کر سکتا ہے اور گو جانوروں میں قدرت کا یہ دستور رائج ہے کہ جب انکی پرورش ایک حد پر پہنچ جاتی ہے تو پھر نہ باہم ان میں کوئی علاقہ باقی رہتا ہے نہ ایک دوسرے کی احتیاج بلکہ جسقدر محدود علم الہامآ جناب باری عز اسمہ کی طرف سے جس کو دیدیا جاتا ہے۔ اسی پر کاربند رہ کر وہ اپنی زندگی تمام کر دیتا ہے لیکن انسان میں چونکہ جوہر عقل بھی پنہاں کر دیا گیا ہے جسے وہ اپنی محنت و کسب سے چمکاتا اور کسب و اکتساب سے پھیلاتا اور بڑھاتا ہے اس لئے اسکی فطرت

کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنے دیگر ابنار جنس کو اپنا ہم خیال اور تابع بنائے اپنے خیال کی تبلیغ میں منہمک ہو کر مشرق اور مغرب کو ایک کر دے اس سے اسوقت بحث نہیں کہ اس کے خیالات حق ہوتے ہیں یا باطل۔ لیکن اس کے لئے ایک طرف اگر وہ مساعی ومسامحت نرمی وتحمل سے مقصد برآری کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے مخالفین ومعاندین سے احقاق خیال وتیسر عزائم کے لئے نبرد آزما بھی ہوتا ہے اسلئے ایسے وقت میں فطرتاً ایک ایسے معتدل نظم کی ضرورت ہے جو عقل وانصاف اور قوت وشوکت کی روشنی میں اس کو جانچے کہ کون ان میں سے حق پر ہے اور کون ناحق پر ہے اور جس کو گمراہی پر دیکھے اس کو بزور وقوت اس سے روکے اور جس کو حق پر دیکھے اس کی تائید وحمایت کرے اور یہ شکل اُسی وقت قائم ہو سکتی ہے جبکہ قوت علم وعمل ایک جگہ اور ایک شخص میں مجتمع ہوں ایسی ہی سطح کو سیادت وخلافت امارت وسرپرستی کہتے ہیں اور ان قوتوں کا جو حامل ہو اسی کو امام وقت کہتے ہیں۔

مدعیان جمہوریت بھی وحدت پرست ہی ہوتے ہیں

اور ایسی ہی جماعت کا جو روح رواں ہو اسی کو خلیفہ وامیر حاکم وسرپرست کہتے ہیں سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو قومیں جمہوریت کی مدعی ہیں ان کے نظام کا نہج بھی واقعتہً شخصیت ہی پر قائم ہوتا ہے مثال کے طور پر دیکھئے کاشتکار پر زمیندار ہوتا ہے اور زمینداروں پر نمبردار نمبرداروں پر قانون گو ہوتے ہیں تو ان پر تحصیلدار تحصیلداروں پر ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہیں تو ان پر حکمراں کلکٹر ہوتے ہیں۔ کلکٹروں پر نگراں گورنر ہوتا ہے تو اُنپر گورنر جنرل مقرر ہوتا ہے۔ غرض اس طرح کروڑوں انسانوں کا کام اور انکی کثرت سمٹتے سمٹتے کس طرح آخر میں ایک بادشاہ وامیر کی ذات میں جاکر جمع ہو جاتی ہے۔

نظام فرنگ کی بنار کیا کثرت پر ہے

اس موقع پر اگر یہ شبہ واقع ہو کہ انگریزوں کا نظام آج دنیا میں مسلم ہے اور انکے نظام کی بنار اونکے مذہب کی طرح کثرت رائے پر ہے۔ اور وہ کامیاب ہے۔ اگر یہ نظام فطری نظام کے مخالف ہوتا تو چاہیئے تھا کہ یہ نظام ناکام ہو جاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو کامیابی کی نوعیت مقرر کرنی چاہیئے اور اس کے بعد غور کرنا چاہیئے سو انکی کامیابی کا معیار تو صرف یہ ہے کہ حصول زر ہو جس طرح بھی بن پڑے اغراض نفسانی بڑے سے بڑے پیمانہ پر حاصل ہوں ان کا مقصد فقط اس دنیا کو حاصل کرنا ہے اور اسکی بنا چونکہ کثرت پر ہے اسلئے یہ نظام انکو سزاوار ہے لیکن مسلمان کی کامیابی کی نوعیت چونکہ یہ ہے کہ اسکی دنیا اور اس کا دین سب کچھ آخرت اور خدا کی رضا کیلئے ہے ایک طرف اگر وہ کسب زر کرتا ہے تو دوسری طرف اسکے خرچ کرنے میں بھی وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ہر ایک سلسلہ میں حدود معین ہیں اسلئے مسلمانوں کے نظام کی بنار کثرت پر قائم نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کے نظام کی بنار وحدت پر ہے

بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کو ساتھ ساتھ چلانا پڑتا ہے اس لئے لازماً انکے نظام میں مرکزیت اور وحدت ہوگی اور انکے نظام دینی و دنیوی کی بنار انبیار علیہم السلام کے قائم کردہ طریق پر اور ان کی حکومت اور ان کی زندگی اصلاح خلق اور تزکیۂ نفس کے لئے ہوگی اور خدا تک پہنچانے والی ہوگی اور بیشک ایسی صورت میں ان کے نظامہائے دینی و دنیوی کا مرجع و مرکز خدا کی ذات ہوگی اور اس قسم کی دہریہ قوموں کا نظام چونکہ بہیمیت ہی کی پرورش پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس میں کثرت کارفرما ہوتی ہے۔ مگر اخلاق انسانی بہائم کے مرتبہ میں پہنچ جاتے ہیں اسلام نے نظام دنیوی کی مرکزیت کا تیسرے

درجہ میں انسان کو پابند بنایا ہے اور دوسرے درجہ میں اطاعتِ رسول کا اور سب سے پہلے درجہ میں اطاعتِ خداوندی کا اور اس قسم کی قومیں اسی تیسرے مرتبہ کی مرکزیت کو مسخ شدہ صورتوں سے قائم کئے ہوئے ہیں اسی لئے دنیا میں دن رات گرفتار ہیں۔ اور مسلمانوں کا نظام چونکہ مرکزیت پر قائم ہے تثلیث پر نہیں ہے، اس لئے اس میں وحدت ہے۔

وحدت غالبہ کا ثبوت انسانی ساخت سے

جسطرح جسم انسانی میں سر حواس خمسہ کا مرکز ہے جس سے تمام ذی حس اعصاب کا صدور ہوتا ہے۔

سننے دیکھنے سونگھنے چکھنے چھونے کی تمام کیفیات اور ان کی اطلاعات سر کی طرف منتقل ہوتی ہیں اور جسم کی تمام حرکات عملی کو قائم و باقی رکھنے والی ایک ہی چیز ہے اور وہ سر ہے۔ اگر سر کو جسم سے الگ کر لیا جائے تو بقیہ جثہ بھی مرکز بے حس ہو جائے گا نہ غذا حاصل کر سکے گا نہ جسمانی مشین کے تمام کل پرزے ہی فطری حرکت کر سکیں گے۔ اسی طرح تمام عالم اور اس کی حسن و تربیت کے لئے بھی ایک باختیار خلیفہ کی ضرورت ہے جسپر ہر قسم کے اختلافات جاکر ختم ہو جاویں اور ہر قسم کے اعمال اپنی اپنی جگہ نقطہ اعتدال سے بڑھنے نہ پاویں یہ ہے امیر و سرپرست سلطان و خلیفہ کی اصولی شرعی عقلی و عرفی حیثیت۔

امارت عامہ کا غامض اصول اور اسپر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد

اسی غامض اصول امارت عامہ کو بزرگان دیوبند نے پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے امور جزئیہ و کلیہ کی بناء شخص واحد پر رکھی جنکا تعامل بلاشبہ ان کے متوسلین و منتسبین کیلئے باعث

صد فخر وحجت ہے۔ اس مقدس اصول کو مشعل راہ بنا کر ایسے تہتر سال قبل جب بزرگان دیوبند نے دارالعلوم دیوبند جیسے سرچشمہ فیض وہدایت کی بنیاد ڈالی تو اس محفل علم وعرفان اور بزم ہدایت وارشاد کا صدر اور روح رواں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ کو بنایا اور انہی کے امر وارشاد سے اس سرچشمہ علم وہدایت کے تمام امور مہمہ انجام پاتے رہے۔

دارالعلوم کے برگزیدہ بانیوں کا اُسوہ بلاشبہ ایک کامیاب اسوہ ہے۔

چونکہ دارالعلوم دیوبند اس صدی میں ایک مجدد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مقدس بانیوں کا زہد وتقوی اور علم کتاب وسنت ایک مسلمہ چیز ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم اپنے مذکورہ علمی دعوی کی دلیل میں اکابر مرحومین ومقدس بانیان دارالعلوم کا طرز عمل پیش کردیں جو طرز عمل بلاشبہ ایک کامیاب طرز عمل ہے اور جس کے ٹھوس نتائج کا آج اُن دلدادگان مغرب کو بھی اعتراف ہے جو موجودہ طرز سے کام کے عادی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ کاغذات قدیمہ اور روئداد ہائے کہنہ سے اس حقیقت کو بے نقاب کردیں کہ ان حضرات نے دارالعلوم دیوبند کی بنا رجمہوریت محضہ پر ڈالی یا وحدت خاصہ پر سو اس کو بزرگانِ سابق کا طرز عمل خوب واضح کردے گا۔

تعامل ونظائر بزرگانِ سلف دارالعلوم دیوبند

سو دارالعلوم دیوبند کے سابقہ کاغذات اور اس کی قدیم رودادوں کے دیکھنے سے یہ امر بداہتہً محسوس ومشاہد ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے ہر دور میں

مختلف عنوانات سے کم و بیش مرکزیت کار کو قائم و مستحکم رکھنے کے لئے ایک مقدس فرد کو ہمیشہ مدار کار بنایا اور یہی سبب قواعد و ضوابط کے عدم تدوین کا بھی تھا ممبران کی کثرت کو ہمیشہ مخل کار اور مضر سمجھا گیا ظاہر ہے کہ جب ممبران قلیل ہوں اور اُن میں سے بھی ایک فرد قلباً و اعتقاداً عرفاً و عملاً قانوناً و شرعاً معتمد علیہ مدار کار ہو تو پھر قوانین کی بھرمار کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ اس دور اخلاص میں نہ دستور اساسی کی طویل دفعات پاس کی گئیں تھیں نہ ہی بائی لاز بنائے گئے لیکن جوں جوں زمانہ میں آزادی و خود رائی بڑھتی گئی اکابر دارالعلوم کو ضرورت محسوس ہوئی کہ شوریٰ کے لئے چند قوانین وضع کریں اور پھر جو ذات مرجع الامر ہو اس کے اختیارات بھی قلمبند ہوں چنانچہ ۱۱ھ میں اہلِ مشورہ کے لئے چند قوانین وضع کئے گئے تو ۵۴ھ میں چند اصول انتظام تجویز کر کے اس میں شوریٰ اور سرپرست کے اختیارات جدا جدا تشخیص کئے گئے تاکہ مدرسہ قانونی اور عملی فتنوں سے محفوظ ہو جائے اور ایک ایسی مضبوط سطح انتظام کی قائم ہو جس کے بعد طلبہ سے فتنہ ہو تب وہ اصول مدافعت کریں مدرسین سے کوئی شور برپا ہو تب وہی اصول مانع آئیں، ممبران میں کشمکش ہو تب وہی اصول حَکَم بنجائیں۔ اس کے بعد ہم چند نظائر اور واقعات کاغذات سابقہ سے پیش کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی بنا ۱۲۸۳ھ میں ڈالی گئی چند حضرات اہل اللہ نے باہم مشورہ کر کے اس کارِ عظیم کا ایک خاکہ تجویز کیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ جنکی توجہات باطنی سے یہ داعیہ قلوب میں پیدا ہو رہا تھا اس بزم مقدس کا ان کو ساقی بنایا گیا اور جملہ مہمات میں انہی کو مدار کار قرار دیا گیا۔

جب مدرسہ بفضلِ ایزدی قائم ہو کر روز بروز ترقی کرنے لگا تو ۱۳۰۸ھ میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ نے ایک تحریر بعنوان گذارش مرتب کر کے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رح حضرت بانی مدرسہ رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی جو بجنسہ درج ذیل ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مدرسہ کے امور جزئیہ وکلیہ کی بنا شخص واحد پر دارالعلوم کے اکابر نے رکھی تھی اور جماعت کو اس کا معین ومحافظ بنایا تھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دورِ اوّل

گذارش

قیام مرکزیت جزئیہ وکلیہ (۱) ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بنا رائے ایک شخص کی پر رہنی چاہیئے اس قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہلِ مشورہ میں سے دخل نہو الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقعہ پر اظہار فرماویں جیسا اہلِ شوریٰ ملکر پسند کریں مقبول ہوگا۔

نوٹ:۔ اس دفعہ سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ کی اندرونی جزئی معاملات میں مہتمم اپنی صوابدید پر جو مناسب سمجھے گا وہ کرے گا۔ مجلس شوریٰ کی حیثیت مہتمم کے لئے نگراں کار کی نہو گی۔ اس کی تشریح حضرت مولانا محمد حاکم

صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ اپنے اصول ہشتگانہ نمبر(۱) میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ :

مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے (یعنی کبھی اس کا خلاف نہ ہو) کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو اپنی بات کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اُس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے ہر وقت مشورہ نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہو۔ اسلئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہو بدل وجان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اتفاقاً کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدر ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص محض اس وجہ سے ناخوش نہو کہ مجھسے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے (از القاسم دار العلوم دیوبند نمبر)

نوٹ : اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک طرف جہاں حضرت قدس سرہٗ نے مشورہ کی ضرورت واہمیت واضح فرمائی ہے وہیں مہتمم کو مجاز ومختار بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ مہتمم کا صرف دائمی اہل مشورہ کی رائے کا پابند نہونا بلکہ ہر وارد وصادر عالم وعاقل سے بھی خواہ مدرسہ سے مشورہ لینے کا مجاز ہونا اسکی بین

دلیل ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ممبران مشورہ کو ہیئت حاکمہ کی حیثیت نہیں دے رہے ہیں بلکہ اہل مشورہ کو مہتمم کا معین ہی ظاہر فرما رہے ہیں، یہی طرز قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے نظم کا رہا ہے کہ اس میں جس قدر لوگ بھی کام کرتے تھے وہ مختلف الخیال مختلف المشرب نہوتے تھے۔

(۲) امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا۔ مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہیئے۔

(۳) جس کسی صاحب کو خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق کو کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے حاجت مزاحمت نہیں جلسہ مشورہ میں پیش کر کے اس کو طے کرلیں اور جیسا کہ قرار پاوے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہوگا۔

نوٹ: ان دونوں دفعات سے بھی یہی واضح ہے کہ دارالعلوم کا انتظام اس کے قرن اول میں مہتمم کی رائے پر منحصر تھا۔ البتہ اگر اہل مشورہ مل کر کوئی بات طے کرتے تھے تو مہتمم کو اس کی تعمیل سے عذر بھی نہوتا تھا مگر انجام امور جزئیہ کا مہتمم کی ہی رائے پر موقوف ہوتا تھا۔

(۴) مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہوں گے اگرچہ اس کی ہی کسی بات پر خوردہ ہو اور یوں اہل شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔

نوٹ: اس دفعہ سے بھی مضمون بالا کی تصدیق ہو رہی ہے کہ اگر تمام اہل مشورہ بھی کیوں نہ کسی امر کے طے کرنے کی نسبت جمع ہو جاویں گے مگر جب

تک مہتمم شریک جلسہ نہوگا وہ جلسہ ہی نہوگا حتیٰ کہ اگر مہتمم کی کسی بات پر اعتراض ہو تو اس وقت میں بھی اس کی موجودگی ضروری ہوگی۔

(۵) مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام میں انتظار نکر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا۔

(۶) آمدنی مدرسہ مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیوں کہ صرف ضروری کیلئے کسیقدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہوجایا کرے گا تو خزانچی کے پاس جمع کردیا جاوے گا۔

(۷) ہر روز وقت مقررہ پر مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کریگا۔

(۸) مناسب ہے سب اہل مشورہ ملکر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سند رہے، فقط

العبد	العبد	العبد
ذوالفقار علی	محمد عابد	محمد قاسم عفی عنہ

تحریر تاریخ ۳ ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ

امور کلیہ میں مرکزیت

نوٹ:۔ بزرگوں کی اس مصدقہ دستاویز سے یہ صاف واضح ہے کہ امور جزئیہ کی بنا ایک شخص پر ہونی چاہیئے لیکن امور کلیہ میں جو مرکزیت شوریٰ میں قائم تھی اب اس کو بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم اول مدرسے

۹ رمضان المبارک ۹۴ھ کو اہلِ مشورہ کے سامنے درخواست پیش کی کہ مجھ کو میرے پیر و مرشد جناب مولانا شاہ عبدالغنی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ لہٰذا بندہ کی حاضری حجاز ضروری ہے۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ اوائل یا وسط شوال سال حال میں سفر عرب شریف کا اختیار کروں۔ لہٰذا گذارش ہے کہ رخصت ماہ شوال کی بلا وضع تنخواہ اور رخصت پانچ ماہ من ابتدائے یکم ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ لغایۃ آخر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ بعوض منشی فضل حق صاحب بوضع کل تنخواہ عنایت فرمائی جائے۔ دستخط مہتمم معہ مہر العبد رفیع الدین۔

مہتمم مدرسہ کا طویل رخصت لینا اور اپنی قائم مقامی کے لئے اپنے ایک معتمد آدمی کو پیش کرنا کوئی معمولی جزئیہ نہ تھا۔ حضرت بانی مدرسہ قدس سرہٗ نے اولاً اسپر تحریر فرمایا کہ مولوی رفیع الدین صاحب کی کارگذاری کی شکر گذاری اس سے بھی کیا کم ہو کہ جو کچھ وہ استدعا کرتے ہیں وہ بلا تامل قبول کی جائے۔

العبد

محمد قاسم

اس کے نیچے حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت حاجی محمد عابد صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ کی رخصت بابت ماہ شوال ۱۲۹۴ھ

بلاوضع تنخواہ منظور ہے اور امور کی نسبت (یعنی قائم مقامی مہتمم وغیرہ) بمواجہہ جناب مولوی محمد قاسم صاحب تجویز ہوگی۔

العبد العبد

ذوالفقار علی محمد عابد (ملاحظہ ہو کتاب شوریٰ قدیم کا صـ۱۳)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ہر دو حضرات باوجود عدد میں کثرت رکھنے کے حضرت بانی مدرسہ کی رائے کا اپنے کو محتاج سمجھتے تھے اور حضرت اقدس کی رائے اور ان کا منشار بھی حکم کا مرتبہ رکھتا تھا اور معاملات ابتداءً حضرت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔

غرض امور جزئیہ میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ مجاز و مختار تھے تو امور کلیہ کے محور و مرکز اور مدار حضرت بانی مدرسہ تھے اور مشیرانِ مدرسہ نے یہی اصول کامیابی اپنے لئے مقرر فرمایا تھا۔ بلکہ حضرت بانی مدرسہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد یعنی حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ بھی دارالعلوم کے سرپرست اعلیٰ تھے۔ چنانچہ منشی فضل حق صاحب کی ایک تحریر کتاب شوریٰ میں موجود ہے جس میں حضرات شوریٰ دارالعلوم کو وہ تحریر فرماتے ہیں کہ نیاز مند کو حضرت پیر و مرشد و ہادی برحق جناب حاجی صاحب ادام اللہ فیوضہم نے چند باتیں بہ نسبت مدرسہ موصوفہ کے ارشاد فرمائیں اور بتاکید فرمایا کہ ان کی تعمیل جملہ اہل مشورہ کو واجب ہے ان کو ذیل میں عرض کرتا ہے اور حضرت ممدوح الصدر نے امور موصوفہ کو ایسی تاکید اور تکرار سے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی تعمیل میں کچھ بھی تامل یا توقف درکار نہیں ہے،

اوّل احیاء العلوم وکیمیائے سعادت داخل درس ہونا چاہیئے۔
دوّم ملا محمود صاحب مدرس سوم (جو سب سے پہلے استاد بنا، مدرسہ کے وقت مقرر کئے گئے تھے) کی ترقی پانچ روپیہ کی ان کی پچیس روپیہ تنخواہ پر کرنی چاہیئے یعنی تیس روپے ان کا مشاہرہ ہونا چاہیئے۔
سوم جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول کو اگر وہ ارادہ روانگی مکہ معظمہ کا کریں تو رخصت چار ماہ کی ان کو دیدینا چاہیئے اور اگر کچھ رعایت ممکن ہو تو ان کے حق میں زمانہ رخصت میں کمی نہ کیجاوے۔
چہارم مجمع دستار بندی وغیرہ جو مدرسہ میں سالانہ ہوا کرتا ہے آئندہ بھی اسی طرح سے ہوا کرے کیونکہ ایسے مجمع (دستار بندی) مسلمانوں کو بہت مفید ہیں اس پر قائم مقام مہتمم صاحب نے ان سب امور کو مشتمل ایک رپورٹ اہل مشورہ کے سامنے مرتب کرکے پیش کی جس پر اہل مشورہ نے حضرت سرپرست اعلیٰ کے ان تمام احکامات کی تعمیل فرمائی جس کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

آخر رائے اہل شوریٰ اجراء از شروع جمادی الاول سنہ ۱۲۹۴ھ

اجراء احیاء العلوم کیمیائے سعادت وترقی تنخواہ ملاں محمود بقدر پانچ روپیہ ماہوار وتقرر مولوی عبدالقدیر صاحب بمشاہرہ معہ ماہوار و اضافہ تنخواہ منشی سراج الحق صاحب محرر دفتر بقدر دو روپیہ ماہوار منظور ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب کو از ماہ مبارک لغایۃ آخر ماہ

محرم رخصت پانچ ماہ نصف تنخواہ پر اس شرط سے دی جائے کہ مولوی صاحب رخصت منظور شدہ سے بے ضرورت شدید مثل بیماری وغیرہ مدرسہ سے زیادہ غیر حاضر نہ رہیں اور اگر رخصت منظور شدہ سے بے وجہ مذکور غیر حاضر رہیں تو رخصت ہائے مذکور بوضع کل تنخواہ محسوب ہوگی۔

العبد العبد العبد العبد

فضل حق عفی عنہ ذوالفقار علی عفار اللہ عنہ محمد قاسم عفی عنہ محمد عابد

نوٹ:- یہ تھا ہمارے اکابر کا تعامل کہ ایک خیال ایک مشرب کے سب حضرات تھے اور سب نے ایک کو اپنا امیر اور بڑا سمجھ رکھا تھا یہی اعتقاد تھا یہی قانون تھا یہی عمل تھا نہ جمہوریت ان کی نظر میں اس سے زیادہ محبوب تھی نہ آج کے عرفی قواعد۔

نتائج؟

(۱) دارالعلوم کا نظام شوریٰ قدیم محض اعتقاد و اخلاص و للّٰہیت پر مبنی تھا نہ سرپرست و مربی جماعت کے لئے کوئی رسمی قوانین مقرر تھے نہ اہلِ مشورہ کی حیثیت اور ان کا مرتبہ حکمرانی تھا اہل مشورہ کی تجاویز اور آراء اخلاصاً و اعتقاداً اہلِ مدرسہ اس لئے واجب العمل سمجھتے تھے کہ وہ چندہ دہندگان کے وکلاء شرعی[ع] ان کو تصور کرتے تھے۔

ع اس وقت یہ حضرات بالخصوص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح اور

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اور یہ وکلا، چندہ دہندگان اپنی تجاویز میں خیر و برکت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ایک ذات مقدس کو اپنا امیر و رہبر بناتے تھے۔ اور جس طرح جہاز کا چلانے والا ایک ہی کپتان ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں جہاز کی باگ ڈور ہوتی ہے اسی طرح ان حضرات نے اس علم کے جہاز کی باگ ڈور بھی ہمیشہ ایک ہی ناخدا کے سپرد کی۔

(۲) چونکہ دارالعلوم کے قرن اوّل میں بوجہ اتحاد مشرب و قیام مرکزیت کوئی اختلافی تجویز موجود نہیں نہ ہی ایسے اختلافات کے وقت رائے شماری وغیرہ کے اصول مدون ہیں اس لئے یہ نتیجہ صاف طور پر تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ بزرگان دارالعلوم کی نظر میں مرکزیت و امارت خاصہ شرعی

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب دیوبندی رح دیوبند اور گردونواح میں اصحاب تعلقات و اثرات تھے اور مسلمان اپنر وثوق اور اعتماد رکھتے تھے اسلئے انھیں حضرات کے سبب عامۃ المسلمین مدرسہ کے ساتھ وابستگی و تعلق رکھتے تھے اور مدرسہ کی خدمات کرتے تھے۔ تو اصل چیز تعارف اور شہرت اور اعتماد و تعلق ہے۔ یہ جسکو حاصل ہو وہی ذریعہ تعاون و خدمت مالیہ ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر جب اہل شوریٰ اس شان کے نہیں رہے اور مہتمم کو یہ شہرت و تعارف و تعلق مع عامۃ المسلمین حاصل رہا تو پھر رجوع عوام اور حصول خدمات میں مہتمم کی شخصیت واسطہ اور ذریعہ بنی لہٰذا وہی چندہ دہندگان کا وکیل ہوا اور افراد شوریٰ کو یہ حیثیت بالکل حاصل نہیں رہی۔

بلکہ افراد شوریٰ کو تو عموماً مسلمان جانتے بھی نہیں اسلئے اب شوریٰ کو چندہ دہندگان کا وکیل سمجھنا قیاس مع الفارق ہوگا جو کہ قیاس فاسد ہے۔

ایک ضروری چیز تھی اور کارخانہ تعلیم دین کی بنا اسی اصول پر اُنھوں نے ڈالی جو ان کا علمی و عملی حیثیت سے ایک نہایت ہی ممتاز و مبارک اقدام تھا اور انھوں نے دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ بحالت غلامی و عدم حکومت اسلامی اسلام کے ایسے زرین اصول ہیں کہ اگر ان پر عملدرآمد ہو تو تب بھی محکوم مسلمانوں کا نظام و انتظام اغیار کی دستبرد سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

(۳) صدر مدرس جو تعلیم کا محور و مرکز ہوتا ہے اس کی غیبت بلاوجہ معقول قابل برداشت نہ ہوتی تھی نہ بغیر کسی شدید مجبوری اور عذر کے منظور ہوتی تھی اور ہوتی بھی تھی تو شرائط کے ساتھ ہوتی تھی جس سے تعلیم کا اہتمام ظاہر ہے اور صدر مدرس کا انہماک فی التعلیم بھی مطلوب و مقصود اکابر ہے۔

(۴) جس طرح ہر گھر میں امور جزئیہ کی ذمہ دار ماں ہوتی ہے اور امور کلیہ کا مرکز باپ ہوتا ہے اسی فطری نظام پر دارالعلوم کی بنا ڈالی گئی یعنی مہتمم کو بمنزلہ ماں کے قرار دیا گیا اور سرپرست مرجع الامر کو بمنزلہ باپ کے اور مشیران مدرسہ بمنزلہ دوست و احباب کے قرار دیئے گئے۔

دورِ ثانی

یوں تو دارالعلوم کے ابتدائی سالوں میں جس قدر بھی حضرات دارالعلوم کے اعضا و جوارح تھے سب ہی مرجع خواص و عوام تھے مگر ان حضرات

نے اصول شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے مہمات ومعاملات دارالعلوم کے لحاظ سے ایک شخص کو مرجع الامر ہمیشہ بنایا چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد یہ مرکز زینت وسرپرستی مدرسہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، صدر مدرس کی طرف منتقل ہوئی جو حسب ذیل تحریر کتاب شوریٰ قدیم سے واضح ہے۔

جبکہ حضرت صدر مدرس صاحب نے بعض مشاغل کیوجہ سے یکسوئی کا ارادہ فرمایا تھا اور ممبران شوریٰ نے اس پر ایک تحریر حضرت کو لکھی "وہو ہذا" حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا۔ ہم اہل مشورہ وفہم مفصل ذیل بخدمت مبارک جناب مخدوم ومطاع مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب دام مجدہم بعد تسلیم مسنون عرض کرتے ہیں کہ یہ مدرسہ عربی دیوبند صرف آپ کے سبب سے آباد ہے اور آئندہ ہم لوگوں کا پختہ خیال یہ ہے کہ اس کی آبادی فقط بدولت آپکی سرپرستی کے ہے اور ہم لوگ تو خادمانہ برائے بیت ہیں دیکھئے کہ جب سے شہرہ آپ کی کنارہ کشی کا ہوا ہے بہت سے طلبہ ادھر اُدھر چلے گئے، اور جانے والے ہیں لہٰذا بدعوائے خادمتہ دلیرانہ عرض کرتے ہیں کہ ہم آپ کو ہرگز نہ چھوڑیں گے کیونکہ آپ کے چھوڑنے سے یہ چشمۂ فیض بالکل مسدود ہوتا نظر آتا ہے ہم لوگوں کی تمنا یہ ہے کہ آپ حسب دستور قدیم کار مدرسہ اپنے تعلق میں رکھیں اور اگر کسی خیال سے صورت حال کی تبدیلی آپ کو منظور ہے تو کسی نہ کسی قسم کا تعلق حسب پسند خاطر مدرسہ سے رکھیں کہ ہم لوگ بدل وجان اس کو غنیمت بارد ہ سمجھ کر منظور کریں گے اُمید کہ یہ عرض منظور ہو کر مزین بہ دستخط خاص ہو۔

العبد العبد العبد العبد العبد العبد
محمد عابد ذوالفقار علی مشتاق احمد فضل حق فضل الرحمٰن

جب یہ تحریر حضرات شوریٰ نے حضرت مولانا صدر المدرسین کی خدمت میں پیش کی تو اس کے نیچے حضرت ممدوح نے یہ تحریر فرمایا۔

احقر آپ صاحبوں کا تابع ہے اور حسب ارشاد تعمیل کرے گا۔

فقط

محمد یعقوب نانوتوی کتاب شوریٰ قدیم صلہ

نوٹ:۔ اس تحریر سے ان اکابر سلف کا پورا پورا طرز عمل مثل آئینہ یہی واضح کر رہا ہے کہ مہمات مدرسہ کا مدار ایک ذات مقدس پر ہوتا تھا۔ اور مرجعیت کاملہ اس کو تفویض کی جاتی تھی اور ممبران شوریٰ برائے بریت اپنے کو سمجھ کر مدرسہ کی آبادی و اسلوبی کیلئے مرجع الامر کے منشاء کے مطابق مصروف فکر و عمل رہتے تھے اور کبھی ممبران و سرپرست کے مابین مروجہ طریق کے مطابق اختیارات کی تشکیل و تقسیم پر مباحثہ مجادلہ نہ ہوتا تھا جیسا کہ آج کل کی عرفی انجمنوں میں ہوتا ہے۔

یہی وہ زریں اسلامی خلافت کا اصول تھا جس پر پہلے مسلمان عامل تھے اب مسلمان یورپ کی پیدا کردہ فضا کی وجہ سے اس کو بہ حقارت دیکھ کر شخص پرستی سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرون اولیٰ میں اور خلافت حقہ کے زمانہ شباب میں انتخاب امیر کے بعد سوائے کتاب اللہ کوئی بھی قانون مدون نہ کیا جاتا یہی وہ گُر تھا جس سے اگلے کامیاب ہوئے اور اسی کے چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی سا کام بھی درست نہیں۔

اب نہ تو وہ پوری نقل بحالتِ اسلام عیسائیت ہی کی اتار سکتے ہیں نہ اسلامی اصول ہی کو اس نقل کی وجہ سے شمع راہ بنا سکتے ہیں۔ نتیجہ یہی ہے کہ اُن کی دنیا بھی درست نہیں ہے اور آخرت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اور جس طرح ترکوں کی نوخیز و نوجوان پارٹی نے اپنی سلطنت محض اسی جمہوریت و شخصیت کے پیچھے تباہ کرلی آج مسلمانانِ ہند کے اجتماعی کاموں کا بھی یہی حشر ہے۔

دورِ ثالث حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد کچھ عرصہ کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ہم عصر اور رفیق و شریک بنا تھے مرجع الامر و مطاع جماعت بنائے گئے اور جب بعض امور میں کچھ اختلاف خیال رونما ہوا تو حضرت حاجی صاحب نے یکسوئی چاہی اور دیوبند سے پیران کلیر تشریف لے گئے جب یہ صورت حال رونما ہوئی تو ممبران کی جماعت پیران کلیر حاضر ہوئی اور حضرت حاجی صاحب سے بصد الحاح عرض کیا کہ حضرت مدرسے آپ کا یکسو ہونا اور مدرسہ کا ویران ہونا ایک ہی چیز ہے اور باہم لازم و ملزوم بہت التجاؤں سے حضرت حاجی صاحب راضی ہوئے اور معروضۂ اہل مشورہ کو منظور فرمایا اور قرار پایا کہ حضرت حاجی صاحب جس طرح بھی امور مدرسہ میں تجویز اور تحریر فرمادیں گے اسی طرح عملدرآمد ہوگا (یہ الفاظ بجنسہ روئداد شوریٰ قدیم کے ہیں) چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے بسبب اپنی کم فرصتی کے یہ تجویز فرمایا کہ بالفعل اہتمام مدرسہ منشی حاجی فضل حق صاحب کے سپرد کیا جاوے وہ پہلے بھی کار اہتمام کو بخوبی انجام دے چکے ہیں حضرت

حاجی محمد عابد صاحب نے جو اس بارہ میں تقریر اہلِ مشورہ کے سامنے کی وہ کتاب شوریٰ میں بجنسہ درج ہے جو یہ ہے :-

عاجز محمد عابد یہ التماس کرتا ہے کہ میں نے بہ نظر للّٰہیت اور درستی و مصلحت مدرسہ کے اہل شوریٰ صاحبان کے کہنے کو مدرسے کے حق میں مفید سمجھ کر یہ تجویز کی ہے کہ بالفعل منشی فضل حق صاحب جو ابتدار مدرسے داخل اہل شوریٰ ہیں اور پہلے کچھ عرصہ تک اہتمام مدرسہ کا کر بھی چکے ہیں اور استعداد تحریر و تقریر وافی رکھتے ہیں۔ اور تدابیر وقوت انتظامیہ سے بھی عاری نہیں ہیں، مہتمم مدرسہ ہوں اور عاجز شریک اہل مشورہ ہر طرح اُن کا نگراں اور معین رہے، بندۂ عاجز نے اس تجویز میں بہتری اور مصلحت مدرسے کے واسطہ سوچی ہے اور اللہ تعالےٰ پر توکل کر کے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ میری یہ تجویز انتظام و آبادی مدرسے کے واسطہ مفید ہوگی الخ

اس پر سب اہل مشورہ نے سمعاً وطاعۃً اپنے دستخط ثبت کئے جنکے اسما یہ ہیں :-

العبد	العبد	العبد
ذوالفقار علی	محمد عابد	فضل حق

العبد العبد

فضل الرحمٰن دستخط پڑھے نہیں گئے غالباً مشتاق احمد

تبصرہ برکارروائی بالا

نوٹ :- اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب

کو جملہ اہل مشورہ نے کلی اختیارات تفویض کئے اور مدرسہ کے نظم ونسق کو حضرت حاجی صاحب کے حوالہ فرما کر جو حضرت حاجی صاحب نے تجویز کیا سب نے برضا ورغبت اس پر دستخط ثبت فرمائے اگر یہ حضرات آجکل کی مروجہ ذہنیت کے مطابق کثرت رائے کے حامی ہوتے یا اسلامی اصول سمجھتے تو کاہے کو اس قدر زحمت گوارا فرماتے اور درو بست مدرسہ ایک ہی کے سپرد کرتے یہی وہ مرکزیت کا اعلیٰ گر تھا جس کو سب حضرات اپنے جذبات کو مغلوب کر کے مضبوط پکڑ کر بڑے بڑے مہمات کو سر کرتے تھے اور آج ہم انہی اعلیٰ اصول کو چھوڑ کر ناکام ونامراد رہتے ہیں۔

دور رابع

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے لیکر حضرت عابد حسین صاحب تک اُنکے زمانہ خیر وبرکت میں باوجودیکہ ہر ایک ان میں سے اپنے اپنے وقت کا مرجع الامر مدار کار مطاع جماعت تھا لیکن سرپرستی کی حیثیت ونوعیت کسی عہدہ کی صورت سے ان حضرات نے بوجہ اپنی طبعی انکسار کے کاغذات میں نمایاں نہونے دی اور اپنے کو زمرہ اہل مشورہ ہی میں مدغم کئے رکھا لیکن حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے مستعفی اور یکسو ہوجانے کے بعد اور مدرسہ میں کچھ خلفشار اور گڑبڑ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سرپرستی کی جو نوعیت بزرگوں کے وقت سے چلی آرہی ہے اُس کو کاغذات وتجاویز میں نمایاں ومندرج کیا جاوے اور جماعت کے قدرتی ہادی قطب العالم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اس جماعت کا سرپرست قرار دیا جاوے۔

چنانچہ ۲۸ر جمادی الاول ۱۳۱۳ھ کو ایک جلسہ ممبران کا منعقد کیا گیا جس میں علاوہ مقامی ممبران کے کچھ بیرونی حضرات مثل حضرت مولانا اشرف علی صاحب وحضرت مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ شریک شوریٰ کئے گئے اور اس جلسہ کی کارروائی جب لکھی گئی تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے اسم مبارک کے آگے پہلی بار کاغذات مدرسہ میں سرپرست مدرسہ لکھا گیا اور آخری زمانہ حیات میں جبکہ حضرت بینائی سے معذور ہو گئے تھے تو جملہ مہمات کا تصفیہ گنگوہ ہی جاکر ہوتا تھا اور حضرت کی رائے مبارک ناطق قرار دی جاتی تھی اس قسم کے واقعات بکثرت کتاب شوریٰ قدیم میں مندرج ہیں جن سب کو نقل کرنے سے یہ مضمون بہت طویل ہو جاوے گا۔ چند واقعات کا لکھدینا کافی ہوگا۔

واقعات بطور نظائر بزمانہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ

(۱) ۲۶ر شوال ۱۳۱۲ھ کے جلسہ شوریٰ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو مہتمم دارالعلوم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مقرر فرمایا جملہ ممبران نے اس بارہ میں حضرت ہی کی رائے مبارک کو تسلیم کیا۔

(۲) مہتمم صاحب موصوف مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اسباق اور وقت درس کے کم کئے جانے کی سفارش کی تو ممبران نے ان الفاظ کے ساتھ تجویز لکھی کہ ہم کو اس سے چنداں خلاف نہیں ہے۔ مگر اس باب میں جناب مولانا سرپرست صاحب مدرسہ کی خاص منظوری اور مصلحت بینی ضرور ہے۔

نوٹ:۔ ان دو اہم معاملات میں حضرت کے مرجعیت کو تجاویز و کاغذات

میں ظاہر کرنا صاف طور پر اس کو واضح کرتا ہے کہ ممبران اہل مشورہ جملہ معاملات میں حضرت کو نہ صرف اعتقاداً و قلباً ہی مدار کل تصور کرتے تھے بلکہ ان کی طے شدہ بااختیار سرپرستی کیوجہ سے اُن کو قانوناً بھی وہ ایسا ہی ظاہر کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اکابر دارالعلوم نے مرکزیت جماعت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

(۳) حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں چونکہ مدرسہ کے کاروبار بہت بڑھ گئے تھے اس لئے ممبران میں اضافہ ہوا اور اختلافات رائے بھی تحریر میں ظاہر ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت سرپرست صاحب کے سامنے ممبران کی جملہ آرار مہتمم صاحب پیش کرتے تھے جن سب کے آخر میں حضرت اپنی رائے اور فیصلہ صادر فرماتے تھے، چنانچہ اس جلسہ میں چند مسائل کی نسبت ممبران کی آرار حضرت کے سامنے پیش ہوئیں جن کے نیچے حضرت نے تحریر فرمایا کہ رائے اہل مشورہ عموماً متفق ہے اور بیانات کے اندر جو فرق اعتباری ہے وہ فرق نہیں ہے لہٰذا اپنے موقع پر سب امور پر نظر کی جاوے گی۔

اور چونکہ میں اپنی رائے کو بالتفصیل اہل مشورہ کی رائے کے ساتھ متفق کر چکا ہوں لہٰذا اجرا ان امور کا شوال سے کیا جائے۔

بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی

اس نہج سے صاف عیاں ہے کہ تجاویز ممبران اسی وقت قابلِ عمل ہوتی تھیں جب کہ حضرت سرپرست صاحب کی منظوری ہو جاتی تھی اور یہی طرز ہمارے لئے مثبت مدعا ہے۔

حضرت سرپرست کی رائے اور حکم کا فرق

ممبران قدیم کے طرز عمل اور کتاب شوریٰ سے یہ بھی واضح ہے کہ حضرت سرپرست کی رائے اور حکم دونوں جدا جدا تھے یکم جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب ممبر مدرسہ کی تجویز میں یہ الفاظ کتاب شوریٰ قدیم میں موجود ہیں کہ چونکہ والا نامہ حضرت سرپرست صاحب دام مجدہم کا مورخہ ۲۰ جمادی ۱۳۱۴ھ بایں مضمون صادر ہوا ہے کہ میں بہ سبب تقاضائے اہل سہارنپور کے پسند کرتا ہوں کہ مولوی خلیل احمد کو سہارن پور بشرط رضا مولوی صاحب موصوف بھیجدیا جائے۔

حضرت مولانا کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنی رائے ظاہر فرماتے ہیں کوئی حکم قطعی نہیں دیتے۔ پس مناسب ہے کہ اس بارہ میں اول مولوی خلیل صاحب سے دریافت کیا جاوے کہ اُن کی مرضی کیا ہے۔

دستخط فضل الرحمٰن ممبر مدرسہ

اس کے بعد ممبران شوریٰ لکھتے ہیں کہ چونکہ حضرت مولانا سرپرست مدرسہ نے بعد غور و تامل کے و گفتگوئے اہل مشورہ سہارن پور واسطے جانے مولوی خلیل احمد کے مدرسہ میں بہ تنخواہ للحہ حکم قطعی صادر کر دیا ہے الخ

پس مہتمم صاحب اس کے موافق عمل کریں اس تحریر سے صاف عیاں ہے کہ جو طریقہ دور اوّل و دور ثانی دور ثالث میں رائج تھا اس کے بموجب اس دور رابع میں بھی باضافہ عنوان حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کو بااختیار سرپرست اور مدار کار امیر حضرات اہلِ مشورہ نے تجویز فرما کر مہتمم صاحب

کو حکم دیا کہ حضرت کے احکام کو بجالائیں اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف تجاویز ہی میں آزاد تھے بلکہ اندرون مدرسہ بھی حضرت ہی کی رائے مبارک کے موافق عملدرآمد ہوتا تھا۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مرجع الامر کے حکم قطعی کو اہل مشورہ نہ توڑ سکتے تھے۔

---

۲۱ شوال ۱۳۱۶ھ کو جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جس میں مقامی ممبران ہی کی شرکت تھی کیفیت ان الفاظ کے ساتھ لکھی گئی۔

اوّل جمع خرچ ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۶ھ دیکھا گیا دوم اس مراسلت کو دیکھا جو بابت ترقی مدرسان عربی و تقرر ایک مدرس جدید واسطے تعلیم ابتدائی کے عرصہ سے مابین اہل مشورہ و حضرت سرپرست صاحب مدرسہ کے جاری تھے حاصل اس کا جو حضرت موصوف نے آخر میں تجویز فرمایا یہ ہے کہ یکم شوال ۱۳۱۶ھ سے مولوی محمد حسن صاحب مدرس مولوی منفعت علی صاحب مدرس مولوی حافظ احمد صاحب مہتمم مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نائب مہتمم و مفتی مدرسہ کو پانچ پانچ روپیہ ماہوار اور مولوی غلام رسول صاحب کو تین روپیہ ماہوار اور حافظ نامدار مدرس قرآن شریف کو ایک روپیہ ماہوار ترقی دیجائے پس ہم اہل مشورہ حسب تجویز حضرت سرپرست صاحب کہتے ہیں کہ مہتمم صاحب یہ ترقیات جاری کردیں۔

مولوی گل محمد خاں صاحب مرحوم کو اس جلسہ شوریٰ میں حسب تجویز سرپرست صاحب رکھا گیا تھا۔ اُن کے متعلق ممبران نے لکھا کہ بعد چھ ماہ کے مہتمم صاحب بہ نسبت کارگذاری وغیرہ مولوی گل محمد خاں صاحب کی مفصل

کیفیت اہل مشورہ کے پاس بھیجدیں تاکہ ان کے استقلال وغیرہ کی نسبت بخدمت حضرت سرپرست صاحب عرض کیا جاوے الخ

العبد	العبد	العبد
ظہور الدین ممبر	فضل الرحمٰن ممبر	ذوالفقار علی ممبر

نوٹ: اس تجویز سے عیاں ہے کہ حضرت سرپرست کا فیصلہ آخر میں صادر ہوتا تھا اور وہ قطعی ہوتا تھا ممبران شوریٰ چھوٹی چھوٹی جزئیات میں بھی حضرت سرپرست ہی کے حکم کے مطابق کام کرتے تھے جو کھلی دلیل حضرت سرپرست کے مرجع الامر باختیار و مختار کل ہونے کی ہے اور ہمارے دعوی مرکزیت کے لئے مثبت ہے۔

دور رابع کی سرپرستی نہ صرف اعتقادی سرپرستی تھی بلکہ تجاویز و کاغذات مدرسہ میں بھی باضابطہ آچکی تھی اور یہاں تک اس کا اثر پہنچ چکا تھا کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کو تحریرات میں عہدہ سرپرستی ہی کے لحاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔

سنہ ۲۴ کی کیفیت جلسہ میں درج ہے ملاحظہ ہو ص۱۸

(۱) اگرچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بزمانہ حیات حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بھی مدرسہ کے معاملات میں شریک اور اس کے نگراں رہتے تھے لیکن بعد وفات تو تمام امور کا انحصار آپ ہی کی ذات پر ہوگیا۔

(۲) جلسہ شوریٰ یکم ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۰ھ میں عبارت ذیل کیفیت شوریٰ میں درج ہے جو قابل ملاحظہ ہے، طے ہوا کہ کاغذات و تجویزات بجنسہ بخدمت حضرت سرپرست مدظلہم بھیجی جاویں اور حضرت ممدوح جیسا ارشاد فرماویں

تعمیل کی جاوے۔ اس جلسے میں مولوی محمد احمد ساکن نانوتہ کو شرائط وظیفہ سے مستثنیٰ کئے جانے کی نسبت حضرت مہتمم صاحب نے بلحاظ اُن کے حقوق خاص کے ممبران میں رپورٹ کی دو ممبران نے مہتمم صاحب کی رائے سے اتفاق کیا مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اختلافی رائے ان الفاظ کے ساتھ تحریر فرمائی۔

دفعہ ۴ کی تجویز چونکہ خلاف قاعدہ مستمرہ مدرسہ ہے لہٰذا مجھ کو اس کی منظوری میں تامل ہے مگر منظوری و نامنظوری جناب سرپرست صاحب سے مصلحت وقتی واضح ہو جائے گا دستخط ذوالفقار علی۔

حضرت سرپرست صاحبؒ نے دو ممبران کی رائے کی موافقت کی اسلئے جلسۂ شوریٰ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ کتاب شوریٰ میں مرقوم ہے کہ مسل ۴ بعد ملاحظہ سرپرست واپس آئی چونکہ سرپرست تجویز ممبران کو منظور فرماتے ہیں لہٰذا مسل دفتر میں رہے مسل ۴ بعد ملاحظہ جناب سرپرست صاحب واپس آئی جناب ممدوح وظیفہ محمد احمد طالب علم کو برغبت منظور فرماتے ہیں لہٰذا اسکو وظیفہ دیا جاوے۔ دستخط ممبران

کیا ایسے صریح نظائر اور تعامل کے بعد بھی ہمارا یہ دعویٰ محتاج دلیل ہے کہ دارالعلوم کی بنا جمہوریت پر نہیں ڈالی گئی بلکہ اس کے امور جزئیہ وکلیہ کی بنا شخص واحد ہی پر رہی ہے۔

ایسے نظائر کو محفوظ رکھنے کے متعلق بھی کتاب شوریٰ قدیم میں ہدایت ہے کہ اُن کو بحفاظت تمام رکھا جائے، کیونکہ یہ وہ مقدس تعامل اور بزرگوں کی تحریرات ہیں جو یقیناً مابعد کے کارکنان کے لئے بہترین اُسوہ ہیں۔

دورِ خامس

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد گو کوئی شخصیت باضابطہ طریق پر اس نہج سے سرپرست مقرر نہ ہوئی تھی مگر چونکہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ جماعت میں ایک اعلیٰ اور نمایاں مرتبہ کرامت رکھتے تھے بیشتر خدام حضرت مولانا گنگوہی وحضرت نانوتوی حضرت دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ہی کو اپنا بڑا اور مقتدا سمجھتے تھے۔ نیز حضرت دارالعلوم کے صدر مدرس تھے اس لئے حضرت کی وفات کے ایک عرصہ کے بعد حضرت ہی جماعت کے بڑے اور سرخیل وسرتاج شمار ہونے لگے اور مالٹا سے واپس تشریف لانے کے بعد سے تو بیشک حضرت ہی مرجع الامر کلیۃً شمار ہوتے تھے جیساکہ روئداد ہائے مدرسہ سے ظاہر ہے ذی شان سرپرستی جسکو خواہ اعتقادی کہیئے یا کچھ اور اس دور میں پوری طرح نمایاں رہی۔ اسی دور کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت مہتمم صاحب مرحوم سے جب خطاب شمس العلماء کی واپسی کا مطالبہ چند اخبارات نے کیا تو حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا کہ حضرت اگر آپ کا حکم ہے تب تو ذرا بھی کوئی پس وپیش واپسی خطاب میں نہیں لیکن محض اخبارات کی چیخ وپکار سے تو ہم خطاب کو واپس کرنا بے محل سمجھتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ ابھی آپ توقف کریں میں سوچ کر جو میری رائے ہوگی وہ عرض کروں گا۔ چنانچہ ایک روز حضرت نے تمام مدرسین وارا کین دارالعلوم کو اس مشورہ کے لئے جمع کیا اس میں حضرات مہتممین رحمہما اللہ بھی تھے۔ دارالمشورہ میں یہ اہم اجتماع ہوا حضرت نے اولاً سب سے رائے لی کہ خطاب واپس ہونا چاہیئے۔ یا نہیں اس میں بعضوں کی رائے تھی کہ خطاب واپس ہونا چاہیئے۔ بعضوں کی

رائے تھی کہ ہرگز واپس نہ ہونا چاہیئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا جب نمبر آیا اور انھوں نے اس بارہ میں کچھ تفصیل سے کہنا چاہا تو حضرت نے اُنکی رائے معلوم کرنے کے بعد فرمایا کہ لو میں اپنی رائے بھی عرض کئے دیتا ہوں اور اس کے بعد حضرت نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات بچشم پُرنم بیان کرنے شروع کئے اور اپنے قلبی تعلق کا اظہار اور اس کے بعد فرمایا کہ میری رائے بھی یہی ہے کہ یہ خطاب واپس کر دیا جاوے اس پر حضرت مہتمم صاحب نے بصد خوشی اس کو مان لیا اور تمام مجمع نے بھی حضرت کی رائے کے بعد سر تسلیم خم کر دیا۔ گو بعض کے ذہن میں اس وقت بھی واپسی خطاب کی مضرتیں پیش نظر تھیں مگر چونکہ وہ اپنے بزرگوں کے اسی اصول کو دیکھے ہوئے تھے کہ جماعت کے سردار کی طرف سے جو رائے کہی جائے اگرچہ وہ اپنی رائے کے خلاف ہو مگر سر تسلیم خم کرنا ہی علامت عبدیت ہے اس لئے سب نے سر جھکا دیا یہ ہے بزرگوں کا وہ اُسوہ جس کی بدولت اجتماعی ادارے اور اُن کے کام چلتے ہیں، لیکن اگر عرفی انجمنوں کی طرح اعجاب رائے سخن پروری ہو تو بلاشبہ کسی طرح بھی اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ اس دور خامس سے بھی ہمارے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ جب تک جماعت کے سردار کی رائے پر انحصار مہمات نہ ہو اُس وقت تک نہ مرکزیت کاملہ قائم ہو سکتی ہے نہ وہ نظام اسلامی نظام کے موافق کہا جا سکتا ہے۔

دور سادس

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک دور ایسا آیا جسمیں

جماعت کا کوئی ایسا با اقتدار بڑا نہ رہا تھا کہ جس پر ساری جماعت عقیدۃً جمع ہو جائے۔ اس لئے گو جماعت علمائے دیوبند کی مرکزیت کا ملہ حضرت کی وفات کے بعد سے ختم ہو گئی تھی لیکن جماعت دارالعلوم نے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پر ضرور اتفاق کر لیا تھا کہ جو اُن کا حکم ہو گا اس کی تعمیل ہو گی گو اُن کا حکم دائرہ مدرسین و ملازمین دارالعلوم پر قانوناً بھی مؤثر تھا لیکن یہ چیز اس سے بہت بالا تھی جو نسبت قاسمی و ذاتی وجاہت کی وجہ سے اُن کو حاصل ہوئی حضرت مہتمم صاحب مرحوم کے دکن تشریف لیجانے کے بعد یہ مرکزیت قدرتاً ان کے نائب اور دارالعلوم کے روح رواں یعنی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہو گئی، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ جیسے جلیل القدر یگانۂ روزگار عالم نے بھی دارالعلوم اور جماعت دیوبند کے اس دیرینہ اصول کے مدنظر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی سیادت و امارت کو تسلیم کیا اور نہ صرف قانونی دائرہ میں بلکہ علماً و قلباً اُن کو اپنا امیر بنا لیا۔ چنانچہ برسوں معاملات مدرسہ میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب نے اُن کا اتباع کیا چونکہ حضرت شاہ صاحب کے مزاج میں ایک قسم کا سدِ جلوت زیادہ تھا اس لئے کبھی کبھی اُن کی اس کیفیت کا اظہار سادہ طریق پر بھی ہو جاتا تھا چنانچہ مراد آباد کے اندر جمعیۃ العلماء دیوبند کا اجلاس منعقد ہونا قرار پایا تھا جس میں صدر اور ناظم جمعیۃ العلماء کا انتخاب جدید ہونا تھا، چونکہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کی خواہش یہ تھی کہ مولانا احمد سعید صاحب و مولانا کفایت اللہ صاحب ہی صدر اور ناظم رہیں اور انتخاب جدید میں بھی یہی حضرات منتخب ہوں۔ اس لئے حضرت مولانا مرحوم نے اس ضرورت کا

اظہار حضرت شاہ صاحب و دیگر علماء دارالعلوم پر فرماتے ہوئے جماعتی صورت سے سب کو مراد آباد کے جلسہ جمعیۃ العلماء کی شرکت کے لئے آمادہ فرمایا حضرت شاہ صاحب بھی مراد آباد تشریف لے گئے۔ کسی شخص نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ حضرت قیام کب تک رہے گا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی ہمارا تو ارادہ بھی آنے کا نہ تھا۔ لیکن چونکہ ہمارے امیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہیں اور انھوں نے فرمایا کہ مولوی کفایت اللہ صاحب کو صدر بنوانا ہے۔ اس لئے ہم چلے آئے ورنہ ہمارے سبق کا بہت حرج ہو رہا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی وہیں موجود تھے وہ چاہتے تھے کہ یہاں پر اس سادہ طریق پر اس حقیقت کا اظہار مصلحت کے خلاف ہے، مگر حضرت شاہ صاحب اپنی سادگی میں فرما گئے مجھے دکھلانا یہ ہے کہ اس دور میں بھی اکابر وقت نے اس اصول کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور جب یہ اصول ہاتھ سے چھوٹا تو مدرسہ میں عظیم الشان فتنہ و ہنگامہ برپا ہوا۔

دور سابع

چونکہ مدرسین و اراکین دارالعلوم کے مابین ۱۹۲۶ء میں رونما ہوا اور بڑا سبب اس کا یہی تھا کہ اُنکی مرکزیت میں فتور اور نقصان واقع ہو گیا تھا اسلئے ۱۹۲۶ء میں پھر اس جماعتی اعلیٰ مرکزیت کو قائم کرنے کی فکر لاحق ہوئی چنانچہ ۱۹۲۶ء کی مطبوعہ روداد شوریٰ کے الفاظ بجنسہ درج ذیل ہیں۔

❊

تجویز سرپرست دارالعلوم

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی وفات کے بعد دارالعلوم کے لئے کسی سرپرست کا تقرر نہ ہوا تھا حالانکہ حسب روایات قدیمہ دارالعلوم کے لئے کسی مقدس ذات کو سرپرست ہونا چاہیئے تھا اس موقع پر مولانا سعید الدین صاحب بہادر نے اس مسئلہ کو پیش کیا اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہم العالی کی ذات مقدس کو سرپرستی دارالعلوم کے لئے تجویز فرمایا۔ ممبران دارالعلوم نے نہایت مسرت و ابتہاج کے ساتھ مولانا سعید الدین صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس تجویز کو منظور فرمایا بلکہ بعض اکابر نے ارشاد فرمایا کہ تجویز ہمارے ذہن میں تھی جس کے اظہار کی نوبت نہ آئی تھی۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے اس کے قبول فرمانے میں اپنے اعذار کا بہت کچھ اظہار فرمایا لیکن حضرات ممبران اور مہتمم مدرسہ کے اصرار پر اُس کو قبول فرمالیا۔"

ملاحظہ ہو صفحہ روئداد شوری ماہ شوال ۴۴ھ

۴۴ھ میں حضرت سرپرست صاحب کے لئے مفصل اختیارات تشخیص کر دیئے گئے اور آئندہ نظم و نسق اور اصول انتظام کو مستحکم کر دینے کے لئے اور روایات قدیم کے بموجب اختیارات اعتقادی کو قانونی صورت میں لانے کے لئے ۴۵ھ کے اندر جو جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جو اپنے انعقاد کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس میں حضرت سرپرست صاحب کے اختیارات کو شائع کر دیا گیا۔ چنانچہ الفاظ روئداد ۴۵ھ ملاحظہ ہوں۔

(۱) دفع قواعد مجلس شوریٰ کی دفعہ ۴ درباره فیصلہ مسائل مطابق رائے

حضرت سرپرست پیش ہوئی باتفاق طے پایا کہ بالکل مناسب ہے اور ممبران کے اصرار پر حضرت سرپرست صاحب مدظلہ نے بھی اس کو منظور فرمایا اسی دفعہ ۴ کے اختیارات کا ابتداءً استعمال یوں ہوا کہ مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے بہ تائید مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم تحریک کی کہ مجلس شوریٰ کا ممبر مولوی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند مولانا حسین احمد صاحب مدرس حدیث سلہٹ اور مولانا شبیر احمد صاحب دیوبندی کو بنایا جائے ممبران کا اس میں اختلاف ہوا تمام آرا کو سننے کے بعد حضرت سرپرست نے ارشاد فرمایا کہ کثرت رائے ان تینوں حضرات کے ممبر نہ کئے جانے کی طرف ہے اسی پر فیصلہ کیا جائے"۔

ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲ روئداد ۴۵ھ مطبوعہ

"۳۰ شوال ۴۵ھ کے جلسہ تھانہ بھون میں جبکہ مجلس شوریٰ ۴۵ھ کے قواعد دارالعلوم کی دوبارہ خواندگی"۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب اور دیگر نامور جلیل القدر علماء کے مواجہ میں شروع ہوئی اور اس میں دفعہ ۳ و ۴ کی خواندگی کی نوبت آئی جن پر دو دفعات کا تعلق روایات قدیمہ سے تھا تو دفعہ ۳ پر اولاً بحث ہوئی بعد ضروری بحث کے یہ دفعہ ۳ اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی کہ جب اتفاق رائے جملہ ممبران کا ہو جائے وہ سرپرست مستقل ہوگا اور درصورت اختلاف رائے (وقت انتخاب) کوئی سرپرست مستقل نہ کیا جائے گا بوقت انعقاد جلسہ ممبران شریک جلسہ سے بکثرت رائے صدر جلسہ منتخب کیا جا سکے گا۔ یہ بحث اصل میں انہی روایات قدیمہ کی وجہ سے کی گئی تھی کیونکہ سرپرست ہمیشہ وہی ہوئے جن پر سب کا اتفاق

ہوا ہے۔

اس کے بعد دفعہ ۴ پڑھی گئی دفعہ ۴ (جس کا حاصل صفحہ ۳ پر بیان کیا جا چکا) میں حضرت مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب نے یہ ترمیم پیش کی کہ کسی مسئلہ میں درصورت اتفاق رائے جملہ ممبران شریک جلسہ کے حضرت سرپرست کی رائے پر آخری فیصلہ کو منحصر رکھنے کے ساتھ مجھ کو اتفاق نہیں ہے صرف درصورت اختلاف رائے خواہ کثرت یا قلت کسی طرف ہو حضرت سرپرست کی رائے پر آخری فیصلہ رکھا جانا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس ترمیم کے ساتھ حضرت سرپرست نے اتفاق فرما کر گویا اس مختلف فیہ مسئلے میں ترجیح یہی دی کہ اگر مجھکو درصورت اتفاق رائے ممبران اختلاف ہوگا تو میں اس کو تحریر کروں گا۔ اس جزو کی بابت بعد ضروری بحث کے جو دراصل روایات قدیمہ کی وجہ سے تھی مصالح وقتیہ اور حضرت کی رضامندی کیوجہ سے یہی طے پایا کہ درصورت اختلاف رائے حضرت سرپرست کی رائے جدھر ہوگی خواہ کثرت کی طرف خواہ قلت کی طرف فیصلہ اسی پر ہوگا۔

دیکھئے اس دور سابع میں بھی ہنگاموں اور فتنوں کے شباب کے باوجود حسب روایات سلف دارالعلوم دیوبند نے اپنی مرکزیت کو قائم و مستحکم کرنے کے لئے حضرت سرپرست صاحب کو کلی اختیارات دیکر ابتداءً سرپرست مقرر فرمایا اور حضرت شاہ صاحب کی ترمیم کے پیش کرنے پر جس کا حاصل یہ تھا کہ اختیارات میں کچھ تقیید ہو جائے ممبران نے بادل ناخواستہ حضرت سرپرست کی رضامندی کی وجہ سے اُس کو مان لیا اور آخری فیصلہ حضرت سرپرست صاحب کے اختیارات کے متعلق جسپر حضرت مولانا انور شاہ صاحب جیسے یگانۂ روزگار نمونہ محدثین سلف بھی متفق ہو گئے یہ ہوا کہ مجلس شوریٰ کے جلسہ میں

جو مسئلہ پیش ہوگا اس کی بابت ہر ایک ممبر شریک جلسہ کی رائے تحریر کیجائیگی (جیسا کہ زمانہ سلف میں بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ممبران کی تحریری آرار یکجا پیش ہوتیں تھیں چنانچہ نظائر میں اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا) اور درصورت اختلاف رائے ممبران خواہ کثرت قلت کسی طرف ہو ممبران کی آرار کے بعد حضرت سرپرست کی رائے کے مطابق اس مسئلہ کا فیصلہ سمجھا جائے گا۔

غرض مسئلہ سرپرستی اور اس کے اختیارات خاص کو دارالعلوم کی روایات قدیمہ اور شرعی حیثیت غرض جملہ پہلوؤں سے جانچ کرطے کیا گیا چنانچہ حسب اجازت ممبران وحضرت سرپرست صاحب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم نے دفعہ ۴ کی توضیح فرماتے ہوئے صـ۶۴ پر تحریر فرمایا کہ:

سرپرست صاحب دارالعلوم کو ایسے اختیارات دینا کہ اُن کی رائے خواہ قلت کیجانب ہو یا کثرت کی فیصلہ اسی پر ہوگا بظاہر مستبعد معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں وجہ استبعاد کچھ نہیں معلوم ہوتی اسلام کی حکومت شوریٰ کا طرز قرن اولیٰ میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ بعد استشارہ اہل الرائے خلیفہ عمل میں مختار ہوتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے دارالعلوم دیوبند میں قدیم سے سرپرستوں کو ایسے اختیارات دیئے گئے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے زمانہ خیر و برکت میں یہی طریق عمل تھا با ایں ہمہ سرپرستانِ دارالعلوم نے کبھی ان اختیارات کو بے موقع استعمال نہیں فرمایا۔

خلاصہ

ان سب امور سے واضح ہے کہ اس دور سابع میں بھی جبکہ زمانہ خودداری وخودستائی کا ہے اور طبائع سلیمہ کے علاوہ کثرت سے طبائع کا رجحان مغربیت کی طرف ہے اکابر دارالعلوم نے دارالعلوم کے اصولِ انتظامی کا وہی نہج باقی رکھا اور اس کو قانونی دائرہ میں لائے جس پر دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور زمانہ کی پیہم شورشوں اور آزادی و حریت کے متواتر حملوں کی وجہ سے ان تمام روایات قدیمہ کا ارکان ومدرسین وملازمین کو پابند کر دیا گیا جواب تک کاغذات و تجاویز میں بصورت قانون نہ آئی تھیں اور بے شک زمانہ کے دینی انحطاط کی وجہ سے اس کی ضرورت بھی تھی کہ ایسا کیا جائے اور کم از کم دارالعلوم کا نظام عام انجمنوں سے فائق اور اُن سے ممتاز رہے جس کے قواعد میں بزرگوں کے تعامل کی پوری پوری جھلک موجود رہے۔

بہرحال میں نے جو تفصیل سے اس علمی بحث میں تعامل سلف کو پیش کیا ہے وہ محض اسی غرض سے کہ لوگوں کے سامنے کامیاب راہ دکھلائی جائے۔

پھر ہر ایک شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ جو چیز میں پیش کر رہا ہوں زمانہ ہذا کے جذبات و تخیلات اس کے خلاف جا رہے ہیں۔ مگر ہمارا کام تو صحیح راہ کا پیش کر دینا ہی

ہے اور بس۔

برسولاں بلاغ باشد و بس

وصلی اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ

وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

خاکسار

محمد طاہر بن احمد القاسمی

کان اللہ لہٗ

بحمداللہ تعالےٰ مولانا محمد طاہر صاحب رح کی محققانہ دستاویز ختم ہوئی اس کے بعد علامہ ظفر احمد صاحب فقیہ و محدث کی تحریر پیش کی جارہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

شوریٰ کی بالاتری زمانہ حاضرہ کی ایجاد ہے

از: حضرت علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رح

مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "احکام القرآن علیٰ مسائل النعمان" میں آیت وشاورھم فی الامر کے تحت ارشاد فرماتے ہیں۔

قال الشیخ فی بیان القرآن وفی اطلاق قولہ تعالیٰ فاذا عزمت دلیل علیٰ انہ لا عبرۃ بکثرۃ عدد الرائی فی الشرع والا لقیدہ سبحانہ بشرط ان لا یکون عزمہ علیٰ خلاف ما علیہ الاکثرون من اھل المشورۃ۔

شیخ رح نے بیان القرآن میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول فاذا عزمت کے اطلاق میں اس بات پر دلیل (واضح) ہے کہ شریعت کے اندر (نفاذِ امر میں) کثرت رائے کا کچھ اعتبار نہیں ورنہ تو اللہ تعالیٰ (فاذا عزمت) کو اس شرط کے ساتھ مشروط فرماتے کہ آپ کا عزم اکثر کی رائے کے خلاف نہ ہو (حالانکہ عزم رسول کو اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں فرمایا سو واضح ہوا کہ شریعت میں کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار نہیں ہے)

آگے فرماتے ہیں:۔

والعجب من بعض العلماء من اھل العصر حیث جعلوا الاخذ بالاکثر من الآراء من الواجبات واحتجوا علیٰ ذالک بقولہ تعالیٰ

اور بعض علماء عصر سے تعجب ہے کیوں کہ انھوں نے اکثر کی رائے پر عمل کرنیکو واجبات میں سے قرار دیا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے قول وشاورھم فی الامر سے

وشارهم فی الامر وغفلوا من الطلاق قوله فی نسق الآیۃ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ۔

استدلال کیا ہے اور وہ اس امر سے غافل ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ نے طرز کلام میں فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کو مطلق فرمایا ہے ۔

مطلب مولف یہ ہے کہ عزم میں اکثر کی آرار کی قید نہیں ہے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم پر فیصلہ کا مدار رکھا ہے ۔ اگر فیصلہ کا مدار اکثر کی رائے پر ہوتا تو کلام اس طرح ہونا چاہیئے تھا ۔ فاذا عزم اکثرکم فتوکل علی اللہ ۔ جب تم میں کے اکثر فیصلہ پر عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کرکے کر ڈالا کیجئے (کما ہو الظاہر)

آگے مشورہ کا فائدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

قال الشافعی رح انما یومر الحاکم بالمشورۃ لکون المشیر ینبہہ علی ما یغفل عنہ ویدلہ علی ما لا یستحضر من الدلیل لا لتقلیدہ فیما یقولہ المشیر فان اللہ لم یجعل ھذا لاحد بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حاکم کو مشورہ کا حکم اسلئے دیا جاتا ہے کہ جو بات اس کے ذہن سے غائب ہوگئی ہے اسپر مشیر متنبہ کردے اور جو دلیل ذہن میں مستحضر نہو اس کو یاد دلا دے مشورہ اس لئے نہیں ہے کہ مشیر جو مشورہ دے رہا ہے حاکم اسمیں مشیر کی تقلید ہی (لازماً) کرلے کیونکہ یہ حق سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کے لئے نہیں ہے (پھر مشیر کو یہ حق کہاں پہونچتا ہے کہ اپنی بات منوانے پر اصرار کرے ۔)

فاضل مؤلف عبارتِ مذکورہ سے اس طرح نتیجہ اخذ فرماتے ہیں :۔

وھذا صریح فی عدم وجوب المشاورۃ

عبارت مذکورہ اس باب میں صریح ہے کہ نہ مشاورت

وفی عدم وجوب تقلید المشیرین فالقول بوجوب الاخذ بالاکثر من آراء اهل المشورة من عجائب هذا الدهر الذی هو زمان الابتداع والاختراع فی کل شئ فلاحول ولا قوة الا بالله العلی العظیم فان ذالك لم یکن من دأب السلف قط

واجب ہے اور نہ مشیرین کی تقلید ضروری ہے سو اہل مشورہ میں سے اکثر کی رائے کو لینا اور اختیار کرنا یہ اس زمانہ کے عجائبات سے ہے جو بدعت و اختراع کا زمانہ ہے سو اس سے حفاظت سوائے حق تعالیٰ کی قوت اور طاقت کے نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ سلف کا طریق ہرگز نہ تھا۔

آگے قاعدۂ فقیہ سے استدلال کرتے ہوئے کلام فرماتے ہیں:۔

وقد صرح الفقهاء فی الاصول بان خلاف الواحد قادح فی الاجماع ولو کان الاخذ برای الاکثرین واجبًا لم یکن خلاف الواحد قادحًا قط بل وجب علیه الرجوع الی رأی الجمهور من رأیه۔

اور فقہاء نے اصول میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ ایک (فقیہ) کا خلاف اجماع میں قادح ہے سو اگر اکثر کی رائے کو لینا واجب ہوتا تو ایک کا خلاف ہرگز قادح (فی الاجماع) نہ ہوتا بلکہ اس پر واجب ہوتا کہ اپنی رائے سے جمہور کی رائے کی طرف رجوع کرے۔

پھر ابن القیم کی عبارت ذیل اس کی تائید میں لاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال ابن القیم فی زاد المعاد ما وجدنا فی الادلة الشرعیة ان قول الجمهور حجة مضافة الی کتاب الله تعالیٰ

ابن القیم نے زاد المعاد میں فرمایا ہے کہ ہم نے ادلۂ شرعیہ میں یہ امر نہیں پایا کہ اکثر کی رائے ایسی حجت ہے جو کتاب اللہ یا سنتِ رسول

وسنة رسوله و اجماع الامة
ومن تامل مذاهب العلماء
قديما وحديثا من عهد الصحابة
رضی اللہ عنهم الی الان واستقرأ
احوالهم وجدهم مجمعين
علی تسويغ خلاف الجمهور و
وجد لكل منهم اقوالا عديدة
انفرد بها عن الجمهور ولا يستثنى
من ذالك احد قط ولكن مستقل
ومستكثر۔

یا اجماع اُمت کی طرف منسوب ہو اور جسنے
صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے لیکر
اب تک علماء متقدمین اور متاخرین کے
مذاہب پر غور کیا ہے وہ اُن کو اس پر
متفق پائے گا کہ اُنھوں نے خلاف جمہور
کو جائز رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک
کے ایسے اقوال پائے گا جن میں وہ اکثر کی
رائے سے منفرد ہے اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ
نہیں ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ کسی کے
اقوالِ متفرد کم ہیں اور کسی کے زیادہ

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں:۔

ومن اطلع علی مشاورات الصحابة
فيما بينهم لم يشكّ قطّ انهم
كانوا قد يأخذون بقول الواحد
ويردون به اقوال الاكثرين
من الجماعة وكانوا مرة يردّون
اقوال الجميع فهذا ابوبكر الصديق
رضی اللہ عنه عمل برأيه وحده
فی بعث اسامة و فی قتال
اهل الردة مع مخالفة جمهور الصحابة

اور جو شخص صحابہ کرام کے آپسی مشاورات
پر مطلع ہے اس کو اس میں ہرگز شک نہوگا
کہ وہ ایک کے قول کو لیکر اس سے جماعت
کے اکثر افراد کے قول کو رد کر دیتے تھے۔
اور کبھی سب کے اقوال کو رد کر دیتے تھے، دیکھئے
ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی لیجئے کہ انھوں نے
بعث اسامہ اور قتال اہل الردۃ میں تنہا اپنی
رائے پر عمل کیا حالاں کہ جمہور صحابہ کی
آراء اس میں مخالف تھیں تو آپ نے

فی ذالك فرد آرا ئهم وامر بعث اسامة بالرحيل وقاتل اهل الردة واطاعه فی ذالك الصحابة كلهم وهذا هو مقتضى الاطلاق فی قوله تعالیٰ فاذا عزمت فتوكل علی الله لم يقل فاذا عزمتم اوعزم اكثرهم اونحوه فافهم۔

سبکی آرا ء کو رد فرما کر جیش اسامہ کو کوچ کا حکم فرمادیا اور اہل الردۃ سے قتال فرمایا اور اسمیں جمیع صحابہ نے آپ کی اطاعت فرمائی ۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کے اطلاق کا مقتضیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فاذا عزمتم یا عزم اکثرھم نہیں فرمایا جیساکہ مفصلاً مذکور ہوچکا ہے ۔

وقال فی اعلاء السنن من الجزء الخامس عشر فان قوله (ای ابی بكر) ان الزكاة حق المال كما ان الصلوة حق النفس وقول عمر فوالله ما هو الا ان رايت ان قد شرح الله صدر ابی بكر للقتال فعرفت انه الحق صريح فی انه لم يكن عندهما نص من رسول الله صلی الله عليه وسلم فی ذالك اصلاً۔ ولو كان ذلك بنص من رسول الله صلی الله عليه وسلم صريح لم يقل له عمر كيف تقاتل الناس

اعلاء السنن پندرھویں جلد میں فرماتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ زکوٰۃ حق المال ہے جیسے نماز حق النفس ہے اور حضرت عمر فاروق رضؓ کا یہ فرمانا کہ خدا تعالےٰ کی قسم بس میں نے تو یہ دیکھا کہ بالیقین اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کا قتال کیلئے شرح صدر فرمادیا پس میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے ۔ ان دونوں حضرات کا یہ مکالمہ صاف بتلا رہا ہے کہ ان دونوں کے پاس اس معاملہ میں بالکل کوئی نص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نہیں تھی ۔ اگر یہ معاملہ قتال مانعین زکوٰۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ عصم منی مالہ و نفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ فقال ابوبکر واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکاۃ فان الزکاۃ حق المال الحدیث.

کی طرف سے نص صریح کے ساتھ ہوتا تو اُن سے حضرت عمرؓ یہ نہ فرماتے کہ آپ لوگوں سے کس طرح قتال کریں گے حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے مجھکو حکم کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہانتک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا اُسنے مجھ سے اپنا مال اور جان محفوظ کرلیا مگر اس کے حق شرعی کے ساتھ اور اسکا حساب اللہ پر ہوگا، ابوبکرؓ نے اسکے جواب میں فرمایا قسم خدا کی میں اس سے ضرور قتال کرونگا جسنے نماز وزکوٰۃ میں فرق کیا ہے کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے مطلب یہ کہ اگر نص صریح ہوتی تو وہی پیش کردی جاتی آپس میں بحث

الغرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بحیثیت امیر ہونے کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہ کی رائے پر عمل نہیں فرمایا بلکہ تمام صحابہ کی رائے کے خلاف اپنی ذاتی رائے پر شرح صدر کے ساتھ عمل فرمایا اور تمام صحابہ نے اطاعت قبول کی۔ کسی نے بھی جمہوریت اور کثرت رائے کے ساتھ معارضہ نہیں کیا۔

الحاصل محدث جلیل فقیہ نبیل علامہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہ کا واضح مسلک بھی یہی ہے کہ شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں ہے بلکہ وہ امیر وحاکم کے لئے ایک معین و مددگار جماعت ہے جس کا کام اپنے غور وفکر کے نتائج اور مختلف پہلوؤں کا امیر کے سامنے پیش کردینا ہے تاکہ امیر جمیع پہلوؤں پر غور فرماکر اپنی صوابدید سے ایک رائے قائم فرماکر فیصلہ صادر کردے۔ اسکے بعد شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون ملاحظہ فرمائیں:۔

ارشادِ مبارک حضرت مولانا العارف باللہ شاہ وصی اللہ

نور اللہ مرقدہٗ

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ

اس آیت شریفہ کے تحت حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں:۔
دیکھئے یہاں ان کی مدح اس بات پر فرمائی کہ وہ ہر بات کا اتباع نہیں کرتے بلکہ ان اقوال میں سے جو احسن ہوتا ہے اس کا اتباع کرتے ہیں ——— اب چونکہ کسی معاملہ کے تمام پہلو ایک شخص کے سامنے نہیں ہوتے اسلئے تمام گوشوں کو سامنے لانے کے لئے مشورہ کیا جاتا ہے باقی امیر کو اختیار ہے کہ ان آراء میں سے جس کو احسن سمجھے اس کا انتخاب کرلے (مشورہ) اسی لئے ہے کہ مشورہ کے ذریعہ اس انتخاب کا موقع مل جاتا ہے۔

چنانچہ امام مالک رح سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ ہر شخص جو بات کہدے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو اور اس کا اتباع کر ہی لیا جائے اگرچہ وہ قائل صاحب فضل ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے مومنین صالحین کے اوصاف میں یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے جو قول احسن ہوتا ہے اس کا اتباع کرتے ہیں۔

(ماہ نامہ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ صـ۶)

اس کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رح کا مضمون پیش خدمت ہے:

حضرت مولانا شیخ محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ
شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

مالك عن ابن شهاب عن عبد الحميد بن عبد الرحمن بن زيد بن الخطاب عن عبد الله بن عبد الله بن الحارث بن نوفل عن عبد الله بن عباس ان عمر بن الخطاب خرج الى الشام حتى اذا كان بسرغ لقيه امراء الاجناد ابو عبيدة بن الجراح واصحابه فاخبروه ان الوباء قد وقع بالشام فقال ابن عباس قال عمر بن الخطاب ادع لى المهاجرين الاولين فدعاهم فاستشارهم واخبرهم ان الوباء قد وقع بالشام فاختلفوا فقال بعضهم قد خرجت لامر ولا نرى ان ترجع عنه وقال بعضهم معك بقية الناس و اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا نرى ان تقدمهم على هذا الوباء

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ حضرت عمر بن خطابؓ ملک شام کی طرف روانہ ہوئے حتیٰ کہ جب مقام سرغ پر پہونچے تو انسے فوجوں کے امراء لشکر ابو عبیدہ بن الجراح اور ان کے ساتھی حضرت عمر سے ملے اور بلاء (طاعون) کا شام میں واقع ہونا بیان کیا حضرت بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے ارشاد فرمایا کہ مہاجرین اولین کو بلاؤ۔ پس ان کو بلایا گیا، پھر انسے مشورہ کیا اور انھیں اس بات سے آگاہ کیا کہ شام میں بلاء واقع ہوگئی ہے تو ان لوگوں نے باہم اختلاف کیا بعضوں نے کہا کہ آپ ایک اہم کام کیلئے تشریف لائے ہیں ہماری رائے نہیں کہ آپ اس سے واپس ہوجائیں۔ اور بعضوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ باقیماندہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فقال ارتفعوا عنی ثم قال ادع لی الانصار فدعوتهم فاستشارهم فسلکوا سبیل المهاجرین واختلفوا کاختلافهم فقال ارتفعوا عنی ثم قال ادع لی من کان ههنا من مشیخة قریش من مهاجرة الفتح فدعوتهم فلم یختلف علیه منهم رجلان فقالوا نری ان ترجع بالناس ولا تقدمهم علی هذا الوباء فنادی عمر فی الناس انی مصبح علی ظهر فاصبحوا علیه الحدیث قال فی الاوجز تحت لفظ فنادی عمر، حین استقر رایه علی رای المشیخة۔

(اوجز المسالک ج ۱۲ ص ۱۲۴)

کے صحابہ ہیں ہماری رائے نہیں کہ آپ انھیں اس بلاء پر پیش کردیں تو حضرت عمر نے فرمایا اچھا جاؤ، پھر فرمایا کہ میرے پاس انصار کو بلالاؤ میں ان کو بلالایا تو حضرت عمر نے ان سے مشورہ فرمایا۔ وہ بھی مہاجرین کے راستے پر چلے اور ان کی طرح اختلاف کیا تو عمر نے فرمایا اچھا جاؤ۔ پھر فرمایا کہ یہاں جو قریش کے عمر رسیدہ لوگ ہیں ان کو بلالاؤ میں ان کو بلالایا، پس ان میں سے دو شخصوں نے بھی اختلاف نہیں کیا سب نے کہا کہ ہماری رائے ہے کہ ان لوگوں کو واپس لیجائیں اور اس بلاء پر انھیں پیش نہ فرمائیں تب حضرت عمر نے لوگوں میں اعلان فرمایا کہ میں صبح سواری کے اوپر کروں گا، لہٰذا تم سب بھی سواری پر صبح کرنا۔

حضرت شیخ الحدیث نے اوجز المسالک میں تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت حضرت عمر کی رائے قریش کے عمر رسیدہ لوگوں کی رائے پر قرار پکڑ گئی مستقر و مستحکم ہوگئی اس وقت اعلان فرمایا۔ مطلب یہ ہے، کہ جب تک حضرت عمر کو شرح صدر اور اطمینان قلب نہیں ہوا اسوقت

تک عزم اور فیصلہ کا اعلان نہیں فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ امیر کا جبتک کسی رائے کی طرف میلان و رجحان نہیں ہوگا۔ اس وقت تک رایوں کی قلت وکثرت کی طرف کوئی التفات نہ کیا جائے گا۔ جب امیر کے نزدیک کوئی چیز راجح اور منتخب ہوجائے گی وہ اس پر فیصلہ صادر کرے گا خواہ وہ کسی کی رائے کے موافق ہو یا مخالف ہو۔

اس کے بعد مفتی جمیل احمد صاحب مدظلہ العالی کا مضمون پیش کیا جاتا ہے۔

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہم
مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور، سابق مفتی مظاہر علوم سہارنپور

جمہوریت اسلامیہ و یورپیہ

امور سلطنت میں سے معمولی امور میں ہر طرح کی اجازت اور اہم امور میں جمہوریت ہے مگر جمہوریت دو قسم کی ہے۔ ایک یورپی جمہوریت اور دوسری اسلامی جمہوریت۔

یورپی جمہوریت میں اکثریت پر فیصلہ، اور اسلامی جمہوریت میں سب کی رائیں لے کر اپنے غور کر کے خود حاکم کا قوی ترین حکم پر فیصلہ دینا ہے۔ اگر یورپ کے اثرات سے خالی ہو کر غور کیا جائے تو صرف اسلامی جمہوریت ہی قابلِ قبول ہے، بلکہ تمام دنیا کے ہر ہر کام میں ہر ہر شخص کی معمول ہے۔

اور یورپی جمہوریت کا دنیا بھر میں کہیں وجود ہی نہیں، صرف دھوکا ہی دھوکا ہے اور خطرناک صورت سے ہے۔

اکثریت تو دنیا بھر میں غیر شریفوں، بے وقوفوں، کم عقلوں، کم علموں کی ہے۔ اکثریت پر مدار ہوگا تو انھیں پر مدار ہوگا۔ اگر اکثریت کسی خاص اثر کی وجہ سے حرام کو حلال، حلال کو حرام قرار دے لے تو سب کی گمراہی کا ذریعہ ہے جس کی نظیریں ہمارے ملک میں آج بھی موجود ہیں۔ عائلی قوانین کو اور رجم کو غیر شرعی قرار دینا، حرام کو حلال، حلال کو حرام کرنا ہو رہا ہے۔

اکثریت تو ایک ڈھونگ ہے کیونکہ پارٹیوں کی رائے اپنے سربراہ کی رائے کے تابع ہوتی ہے وہ (سربراہ) ایک ایک ہی ہوتا ہے اس لئے اس جمہوریت کا دنیا بھر میں کہیں وجود ہی نہیں ہوسکتا صرف دھوکا ہوتا ہے۔ اس کو عوام کی حکومت کہکر سخت دھوکا دیا جاتا ہے حالانکہ حکومت جیتنے والی پارٹی کے سربراہ کی ہوتی ہے۔ اگر یہ ایک فرد عوام ہے تو ہر ایک فرد عوام ہوسکتا ہے۔ اس کو عوام کی حکومت، دوسروں کو خلاف کہنا درست نہیں۔

سپاہی سے لیکر اس کے انتہائی افسر تک، ایسے ہی فوج اور ہر محکمہ میں نیچے سے اوپر تک ایک ایک افسر ہوتا ہے وہی سیاہ سفید کرتا ہے، کہاں کی جمہوریت اگر سارے احکام ہر محکمہ کے انفرادی ہیں تو اہم احکام کیوں نہیں (وہ بھی ضرور انفرادی ہیں)

پھر جمہوریت کی بنیاد، خدائی جمہوریت ہے کہ تین خدا ماننے والوں کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ توحید والوں کے خلاف چیز ہے۔

ابتدائے دنیا سے آج تک تمام مقدمات اہم سے اہم مقدمات کے فیصلے ایک حاکم سے ہوتے ہیں اور سب کا نظام اسی پر چل رہا ہے کہیں جمہوریت و اکثریت کی ضرورت نہیں، اٹیلی یا چرچل کی حکومت ہوتی تھی نام جمہوریت تھا حکومت ایک کی۔

اسلامی جمہوریت ایک فطری مسئلہ ہے بچپن سے لیکر بڑھاپے تک اور چھوٹے بڑے کام پر ہر شخص کے یہاں بلکہ جمہوریت یورپی کے دلدادگان کے یہاں بھی یہی (اسلامی) جمہوریت رائج اور ہر ہر جگہ کارآمد ہے۔ دیکھئے آپ کوئی کاروبار کریں، مقدمہ لڑائیں، تقریب کریں، رشتہ منگنی نکاح کریں تعمیر کریں۔

کھیتی، صناعی کارخانہ، کوئی کام بھی کریں اس کام کے ماہرین سے مشورہ لیں گے ان ماہرین سے جن کو آپ ماہر سمجھیں۔ کسی گھاس کھودنے والے، کسی اینٹ بنانے والے، کپڑے دھونے والے، مزدور، بھیک مانگنے والے سے کبھی مشورہ نہ کرینگے یہ حماقت سوائے یورپ کے کسی دوسری جگہ نہ ملے گی۔ پھر سب رائے معلوم کرکے خود غور وخوض کرکے ایک رائے قائم کریں گے۔ اللہ پر بھروسہ ہوگا سب کا اسی پر عمل ہے۔

ابتدائے دنیا سے آج تک ہر شخص اسی جمہوریت (اسلامیہ) پر ہر کام میں عمل کررہا ہے۔ تمام دنیا میں ہمیشہ سے ہر محکمہ کا ایک ایک افسر رہا ہے اور اپنے نزدیک اہل لوگوں سے مشورہ کرکے ذاتی رائے پر کام کرتا ہے۔ ہر مقدمہ میں حاکم سب کے بیان لیتا ہے، ماہرین قانون سے مشورہ لیتا اور پھر خود فیصلہ دیتا ہے۔

اسلام اسی فطری قانون سے کام لیتا ہے اہل لوگوں سے مشورہ لیکر حاکم اللہ کے بھروسہ پر فیصلہ دیتا ہے۔ نمعلوم یورپ کے گرویدہ لوگ کیوں گہری عقل سے کام نہیں لیتے۔

(خصوصیات اسلام ص ۸۳ تا ۸۵)

اس کے بعد امیرِ جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب رح کا مضمون ملاحظہ فرمائیں:

ہمارے ہاں فیصلے کی بُنیاد کثرتِ رائے نہیں ہے

امیرِ جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف رح کا مکتوب

"مشورہ"! کام کے تقاضوں کو سوچنے ان کی ترکیب قائم کرنے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کی شکلیں بنانے میں اور جو احباب اوقات فارغ کریں انکی مناسب تشکیل میں اور جو مسائل ہوں احباب کو مشورہ میں جوڑا جائے۔ اللہ جل شانہٗ کے دھیان اور فکر کے ساتھ دُعائیں مانگ کر مشورہ میں بیٹھیں۔ مشورہ میں اپنی رائے پر اصرار اور عمل کرانے کا جذبہ نہ ہو اس سے اللہ کی مدد میں ہٹ جاتی ہیں۔ جب رائے طلب کی جائے امانت سمجھ کر جو بات اپنے دل میں ہو کہدی جائے، رائے رکھنے میں نرمی ہو۔ کسی ساتھی کی رائے سے تقابل کا طرز نہ ہو۔ میری رائے میں میرے نفس کے شرور شامل ہیں یہ دل کے اندر خیال ہو۔ اگر فیصلہ کسی دوسری رائے پر ہو گیا تو اس کی خوشی ہو کہ میرے شرور سے حفاظت ہو گئی اور اگر اپنی رائے پر فیصلہ ہو جائے تو خوف ہو اور زیادہ دعائیں مانگی جائیں۔ ہمارے ہاں فیصلے کی بنیاد کثرت رائے نہیں ہے، اور ہر معاملہ میں ہر ایک سے رائے لینا بھی ضروری نہیں ہے، دلجوئی سب کی ضروری ہے۔ امیر کو اس بات کا یقین ہو کہ ان احباب کے فکر اور مل کر بیٹھنے کی برکت سے اللہ جل شانہٗ صحیح بات کھول دیں گے، امیر اپنے آپ کو مشورہ کا محتاج سمجھے رائے لینے کے بعد غور و فکر سے جو مناسب سمجھ میں آتا ہو۔ وہ کہہ دے، بات اس طرح

رکھے کہ کسی کی رائے کا استخفاف نہ ہو۔ اگر طبیعتیں مختلف ہوں تو اس بات پر شوق و رغبت کے ساتھ آمادہ کرلے، اور ساتھی امیر کی بات پر ایسے شوق سے چلیں جیسے کہ ان کی ہی رائے طے پائی ہے اسی میں تربیت ہے اگر اس کے بعد عملاً ایسی شکل نظر آئے کہ ہماری رائے زیادہ مناسب تھی پھر بھی ہرگز طعنہ نہ دیا جائے یا اشارہ کنایہ بھی نہ کیا جائے۔ اسی میں خیر کا یقین کیا جائے، جو امیروں کو طعنہ دے اس کے لئے سخت وعید آئی ہے۔

(سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ص۵۸)

اس کے بعد محدثِ وقت حضرت مولانا بدر عالم صاحب کا ایک مختصر مگر جامع مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

افراد کی اکثریت معیارِ صداقت نہیں

حضرت مولانا بدر عالم صاحب کی واضح تحریر

یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے، غور کرنا چاہیئے کہ دورِ فتن میں اہل حق کی اکثریت کب ہو سکتی ہے۔ پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دے دینا اور بھی نافہمی ہے۔ (ص ۸۶ ج ۱ ترجمان السنہ)

بعدہٗ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کا مضمون پیش ہے جو باتفاق ارکانِ جماعت پاس ہو کر علماء کرام کی خدمت میں تصدیق کے لئے بھیجا گیا تھا۔

مشاورت کے بعد امیر فیصلہ کرے گا

مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند
کا واضح بیان

امیر کا طریق کار یہ ہوگا کہ چیدہ چیدہ علماء کی ایک مجلسِ شوریٰ ہوگی جس سے مشاورت کے بعد امیر فیصلہ کرے گا۔ احکامات جاری و نافذ کرے گا۔ جن کی نظیریں قرونِ اولیٰ کے اندر موجود ہیں۔

مکتوب مولانا محمد میاں صاحب
بنام
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب
معارف شیخ ص۵

اس کے بعد سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء ہند کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مفسرِ قرآن سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ

ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی تحریر

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ۔ پھر جب مشورہ کرنے کے بعد کسی جانب پختہ رائے قائم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کرلیا کیجئے ۔
آیت کا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں سے مشورہ کرتے رہا کیجئے تاکہ ان کو خوشی ہو سب کی سن کر عام جذبات کا اندازہ ہوجائے ۔ رائے عامہ کی واقفیت کا فائدہ پہونچے اور آپ کی جانب استبداد رائے کا شبہ نہ کیا جائے ۔ پھر جب مشورہ کے بعد خواہ وہ حسب ضرورت عوام سے ہو یا خواص سے ، آپ ایک قطعی فیصلہ کرلیں اور آخری رائے قائم کرلیں تو جو چیز آپ کے نزدیک بہتر اور مفید ہو اس کو کر لیجئے ۔
آج کل کی یورپین جمہوریت کا اس آیت میں کوئی سامان نہیں ہے ۔ اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود واجب الاتباع تھے اس واسطے آپ پر کسی کی رائے کا اتباع لازم نہ ہوا اور ابوبکر و عمر سے مشورہ کرنا بھی آپ کے لئے استحبابی ہوا ۔ اور آپ کسی اقلیت اور اکثریت کے تابع نہ تھے ۔
بہرحال آپ مشورہ تو کیا ہی کرتے تھے اب اور زیادہ تاکید فرمائی تاکہ مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ آپ کا دل رنجیدہ ہے ، جو آپ نے ہم سے مشورہ ترک کردیا ۔

آپ کی مبارک عادت تو یہ تھی کہ اپنے دئے ہوئے مشورہ پر بھی کسی کو عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتے تھے جیسا کہ بریرہ اور مغیث کے قصہ میں مشہور ہے۔ اور یہ ہی وہ آزادی رائے ہے جس کو اسلام کا طغرائے امتیاز کہا جاتا ہے۔

ہم نے جو کہا کہ اس آیت میں موجودہ جمہوریت کا سامان نہیں ہے یہ اسلئے کہ یہ محض کافروں کی وضع کی ہوئی جمہوریت ہے کہ مسئلہ کی اہمیت پر بحث نہ ہو اور احمقوں کی رائے سے ایک چیز پاس کردی جائے۔ اس لعنتی جمہوریت کے کرشمے ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بعض دفعہ بہترین پبلک مفاد کی چیز گر جاتی ہے اور مخصوص طبقے کے مفاد کی چیز پاس ہوجاتی ہے۔

اسلام کی جمہوریت اس سے بدرجہا بلند ہے اس میں رائے کی آزادی ہے۔ سوچنے سمجھنے کا موقعہ ہے۔ اہم معاملات میں اگرچہ رائے کی تعمیم نہیں ہے لیکن اہل الرائے سے رائے لیا جانا ضروری ہے پھر آخری فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے تاکہ جماعتی نظم قائم رہے۔ یہ نہ سمجھا جائے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس صورت میں مشاورۃ بیکار ہوجائے گی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ مشورہ سے بہت تقویت اور بڑی مدد ملتی ہے۔

——— (تفسیر کشف الرحمٰن)

مؤلفہ مولانا سبحان الہند رح

اس کے بعد مفتی محمود الحسن صاحب مدظلہ العالی کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں جس میں امیر کی بالاتری کی تصریح کی گئی ہے۔

صدر جسے خیر سمجھے اسکو اختیار کرلیا جائے

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

(فتاویٰ محمودیہ جلد اول ص۵۲۷)

مشاورت وجمہوریت سوال ۳۵۴:- وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ - یہ آیت کریمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے یا عام (۲) جمہوریت کسے کہتے ہیں اسلام میں اس کی کیا حیثیت ہے (۳) مدارس میں کمیٹی کا قائم کرنا کیسا ہے اور اسکی کیا صورت ہونی چاہیئے (۴) نیز زید کا یہ کہنا ہے کہ موجودہ دور میں اسلام میں جمہوریت نہیں ہے کیسا ہے زید مذکورہ آیت کو استشہاد میں پیش کرتا ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ موجودہ دور میں لوگوں میں اب اتنی صلاحیت باقی نہیں رہی کہ جمہوریت چل سکے اس صورت میں زید کو اس آیت کا پیش کرنا کیسا ہے۔ کیوں کہ زید نے پہلے کہا تھا کہ اسلام میں جمہوریت نہیں ہے۔ قرآن پاک پکار کر کہتا ہے۔ اور جب آیت طلب کی گئی تو مذکورہ آیت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ جمہوریت نہیں ہے۔ فقط

الجواب: حامداً و مصلیاً۔ (۱) اس آیت میں اصل خطاب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے پھر آپ کے اتباع میں ضمناً اوروں کو ہے مفسرین نے اس آیت کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ 'وشاورہم' میں جو ضمیر مفعول ہے اس کا مصداق بھی سب صحابہ نہیں بلکہ مخصوص رات دن کے حاضر باش اولوالاحلام والنھی اور اہل الرائے ہیں۔ جن کی اصابت رائے کا تجربہ ہوتا رہا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے بھی ان کی رائے کی تصویب فرمائی ہے۔ نیز الامر کا مصداق محققین مفسرین نے عام نہیں لکھا ہے۔ بلکہ خاص امر یعنی الحرب اس کا مصداق قرار دیا ہے، جیساکہ "روح المعانی" وغیرہ میں موجود ہے۔ لہٰذا اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہر کام میں ہر ایک سے مشورہ ضروری ہے صحیح نہیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین سے بہت سے اجتماعی کاموں میں محض اپنی رائے پر عمل کرنا ثابت ہے نیز مشورہ کے بعد بھی ہر مشورہ کا قبول کرنا بھی ضروری نہیں بلکہ امیر کے لئے سب کے مشوروں کو رد کر کے اپنی صواب دید پر عمل کرنا بھی ثابت ہے۔

(۲) آج کل جمہوریت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بالغ مرد، عورت، خواندہ یا ناخواندہ عاقل، سفیہ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ اور ان کے ووٹوں کی اکثریت سے سربراہ حکمران تجویز کیا جاتا ہے۔ اسلام میں اس جمہوریت کا کہیں وجود نہیں نہ کوئی سلیم العقل اس کے اندر خیر تصور کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ اکثریت نادانوں کی اور جاہلوں کی ہے،

وہ لوگ ایسے ہی شخص کو ووٹ دیں گے جس کے ذریعہ سے ان کی خواہشات پوری ہونے کی توقع ہو اور یہ یقین ہے کہ ان کی خواہشات میں خیر غالب نہیں ہے بلکہ شر غالب ہے تو شر پھیلانے والے سربراہ کا انتخاب کرنا کون عقل کی بات ہے جو لوگ سیاست دانی کے دعویدار اور تمام حکومتوں پر بے لاگ تنقید کرنے والے ارباب قلم ہیں وہ بھی اس جمہوریت پر اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہیں اس ملک و حکومت کی سیاہ بختی کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جہاں پر سربراہی کا معیار اہلیت و دلائل سے ہٹا کر عوام کالانعام کی کثرت رائے پر رکھدیا جائے۔

(۳) اہلِ علم، اہلِ دیانت، اہل رائے حضرات کی دینی مدارس کی ظاہری و معنوی ترقی و فلاح کے لئے کمیٹی مقرر کرلینا انشاء اللہ مثمر خیر ہے اور سب ہی مصالح کے پیش نظر بہت اہم ہے۔ طریقۂ کار یہ ہونا چاہیئے کہ مشورہ طلب بات کو کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے ارکان غور و فکر کے بعد اخلاص و دیانت سے جس رائے میں خیر سمجھیں اس کو پیش کردیں۔ ضرورت پیش آئے تو منافع مضار پر بھی متانت و سنجیدگی سے دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں گفتگو اور باہمی تبادلۂ خیالات بھی کرلیں۔ اس بحث و تمحیص کے بعد جو چیزیں خیر ہوں یعنی صدر جسے خیر سمجھے اس کو اختیار کرلیا جائے۔ جنکی رائے پر عمل نہ ہو وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں اور آئندہ رائے دینے سے گریز بھی نہ کریں اور جنکی رائے کو اختیار کرلیا گیا ہو وہ اپنی رائے پر ناز کرتے ہوئے دوسروں کی تحقیر بھی نہ کریں۔

(۴) اسکا جواب ۲ سے واضح ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالےٰ اعلم

حررہ العبد محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند ۱۹/۸۹ھ

مولانا محمد تقی صاحب عثمانی خلف الرشید جناب مفتی محمد شفیع صاحب
نائب مہتمم دارالعلوم کراچی قاضی القضاۃ (جسٹس) پاکستان
کی محققانہ تحریر

اسلام کا نظامِ حکومت

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومت عام طور سے رائج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھیں اور اس پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوتی تھی۔ اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم وستم اور ناانصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لئے اس کے خلاف یورپ میں شدید ردِ عمل ہوا "شخصی حکومت" کو بذاتِ خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ "جمہوریت" کو ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہوگئیں، اور ان کی جگہ جمہوری نظامِ حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا فیشن ایبل نظامِ حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل وانصاف اور حق وصداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گذشتہ (ہجری) صدی سے لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اُٹھی ہیں، ان کے ذہن میں "جمہوریت" کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے "کلمۂ طیبہ" کی ہوگئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا

دنیا بھر پر چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ حاضر میں

جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لیکر اُٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مُسلّم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ اُنھوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرِفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کئے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت ہی احتیاط کی تو یہ کہدیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم اُن کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصوّرات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہو گئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا یا کہنا دنیا بھر کی لعنت و ملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے، اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمۂ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت و تجدید کے لئے منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصوّرات اور خوشنما نعروں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقیدیں

کی ہیں اور اپنے دینی نقطۂ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہارِ رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مُہار نہ ہو سکیں۔ اور چونکہ اسلام نے "مشاورت" کا حکم دیا ہے، اسلئے جمہوریت کو "مشاورت" کے ہم معنیٰ سمجھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جمہوریت عین اسلام ہے۔ حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت "جمہوری نظامِ حکومت" کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لئے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے یہ جملہ مشہور ہے کہ:۔

"جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لئے قائم ہوتی ہے"

لہٰذا "جمہوریت" کا سب سے پہلا رُکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکمِ اعلیٰ تصوّر کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرتِ رائے کی بُنیاد پر ہوا ہو، وہ واجب التعمیل اور ناقابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرتِ رائے کے اس فیصلے پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، اگر دستورِ حکومت عوامی نمائندوں کے اختیارِ قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کر دے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن وسنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لئے واجب التعمیل نہیں

ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی مختار شخصیت نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لئے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرتِ رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرتِ رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرتِ رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رَدّ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدتر قوانین کثرتِ رائے کے زور پر مسلسل نافذ کئے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کئے جا رہے ہیں۔ زنا جیسی بدکاری سے لے کر ہم جنس جیسے گھناؤنے عمل تک کو اسی بنیاد پر سندِ جواز عطا کی گئی ہے، اور اس طرزِ فکر نے دُنیا کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے کثرتِ رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جا بجا تبصرے فرما کر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔

(ترجمہ) اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔"

کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرتِ رائے

ہوگی، وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی تالیفات اور مواعظ و ملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے۔ ایک وعظ میں فرماتے ہیں:۔

"آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرتِ رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی، اسکی رائے جاہلانہ رائے تھی۔"

(فضائل العلم والخشیہ ص۳۰ و معارف حکیم الامت ج ۶ ص۶۱)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرتِ رائے کبھی معیارِ حق نہیں ہو سکتی، کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت ؒ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد حسین الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ

دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بنا پر کثرتِ رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔"
(تقلیل الاختلاط مع الانام ص۔ و معارف حکیم الامت ج۲ ص۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"(غزوہ اُحد میں) اُن پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے، اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے، اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا۔ وہ غرض حاصل ہو چکی، اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا، اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی، اور ہم نے اَب تک جنگ میں کچھ حصّہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیئے۔ ہمارے بھائی کفّار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مالِ غنیمت جمع کر لینا چاہیئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہیئے، مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے، یہ اُن سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسر اُن کے رہ گئے (اس واقعے میں کثرت رائے غلطی پر تھی قلّت رائے صواب پر تھی، جو لوگ کثرتِ رائے کو علامتِ حق

اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی "

حکیم الامت قدس سرہٗ ایک اور وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں :

"اوّل تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے، انکی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں، اَب وہ کثرت کیا خاک ہوئی "[1]

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے، جنکا میدان علمِ سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل مأخذ قرآن وسنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نورِ فراست عطا فرمادیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں۔ جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے، چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراستِ ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علمِ سیاست بیشک آپ کا اصل میدان نہیں تھا۔ لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو، اُسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علمِ سیاست کے وہ ماہرین بھی جنھوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہوکر سوچنے کی

---

[1] وعظ "الانسار" ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۱۰ مطبوعہ ادارۂ اسلامیات، لاہور۔

کوشش کی ہے۔ وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے اپادو رائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ "جمہوریت" کے تعارف اور اس کی کامیابی کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ علمی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے، اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد پر رہتی ہے کیفیت پر نہیں۔ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں، انھیں تولا نہیں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائفِ زندگی میں سے نہیں سمجھتی، چنانچہ اس کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے۔ اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے ہل چلاتی، بیج بوتی، فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی جس کے ذریعہ وہ اُن مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکیں جو انتخابات کے موقع پر اُن کے سامنے فیصلے کے لئے آتے ہیں، لہٰذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہو سکتے ہیں مرہٹی میں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کر سکتی کیونکہ

قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آرا، کو تسلیم کرتے ہیں۔"

مغرب کے مشہور مؤرخ اور فلسفی کارلائل کا یہ اقتباس علمِ سیاست میں کافی شہرت پاگیا ہے کہ:

"انسانی حقوق" میں یقینی طور پر جاہل افراد کا یہ حق سب سے زیادہ غیر متنازعہ ہے کہ عقل مند افراد ان کی رہنمائی کریں اور انہیں نرمی سے یا طاقت کے ذریعہ سیدھے راستے پر رکھیں فطرت کا شروع سے یہی حکم ہے، اسی حکم کو نافذ کرکے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کرکے ہی سوسائٹی کمال تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہے۔ اگر ہم عملی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ روم اور ایتھنز میں دو سے مقامات کی طرح بلند آواز سے رائے شماری کرنے اور بہت سے لوگوں کے بحث مباحثہ کے ذریعہ نہیں بلکہ گنے چنے افراد کے حکم سے کام چلتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سے سچ رہی ہے، لہٰذا آئندہ بھی یہی بات سچ رہے گی۔"

شخصی حکومت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہٗ نے جمہوریت پر تنقید فرماتے ہوئے کئی مقامات پر اس کے مقابلے میں "شخصی حکومت" کی حمایت فرمائی ہے۔ آج کے جمہوریت پرست دور میں شخصی حکومت کی حمایت کلمۂ کفر کی طرح نشانۂ ملامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بنیادی سبب دو ہیں، ایک یہ کہ جمہوریت کی حمایت میں پروپیگنڈہ

اس قدر زور وشور کے ساتھ کیا گیا ہے کہ کسی مخالف نظام حکومت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر ہی ذہن آمادہ نہیں ہوتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "شخصی حکومت" کا نام آتے ہی ذہن ان مطلق العنان بادشاہوں کی طرف چلا جاتا ہے، جن کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور ان پر کوئی بالاتر پابندی عائد نہ تھی، یا پھر اس نام سے ان فاشی حکمرانوں کا تصور آجاتا ہے، جن کے نزدیک حکومت کی بنیاد محض زور زبردستی پر تھی۔ حالانکہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ "شخصی حکومت" سے وہ "مثالی اسلامی حکمراں" مراد لیتے ہیں جسے امیرالمومنین یا خلیفۂ وقت" کہا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو غیر اسلامی شخصی حکومتیں رائج رہی ہیں، ان کی خرابیوں اور مفاسد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ان "شخصی حکومتوں" کی بنیاد بادشاہتوں میں عموماً خاندانی وراثت پر تھی اور فاشزم کے فلسفے میں صرف "قوت" پر جسکا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو قوی ہو، وہ کمزور پر حکومت کا حق لے کر آیا ہے۔ لہٰذا ان شخصی حکومتوں کے قیام میں سنجیدہ غور وفکر اور مناسب انتخاب کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا

(۲) ان شخصی حکمرانوں کے لئے کوئی ایسی صفات اہلیت ضروری نہیں تھیں جن کے بغیر وہ حکمرانی کے منصب تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

(۳) یہ شخصی حکومتیں عموماً ایسے آسمانی قوانین کی پابند نہیں تھیں جو ان کے فیصلوں کو لگی بندھی حدود میں محدود رکھ سکیں۔ لہٰذا قانون ساز وہ خود تھے اور مطلق العنان ہونے کی بنا پر ان کی زبان قانون بن گئی تھی۔

(۴) ان حکومتوں میں کوئی ایسا لازمی ادارہ موجود نہیں تھا جو ان کے اقدامات ان کے صادر کیے ہوئے احکام اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کسی لگے بندھے معیار پر پرکھ سکتا اور انکی طرف سے آسمانی قانون کی خلاف ورزی اپنی حدودِ اختیار سے تجاوز یا کسی ظلم وستم کی صورت میں ان کے اقدامات کی تلافی کر سکتا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر شخصی حکومتوں میں لوگوں کے حقوق پامال ہوئے اور انسان انسان کا غلام بن گیا۔ ورنہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوں تو بیشتر ماہرین سیاست اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی حکومت میں بذاتِ خود کوئی خرابی نہیں۔ وہ جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب اور عوام کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ روسو نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ:

"حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہیئے۔ بشرطیکہ اس بات کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت کریں گے، نہ کہ اپنے مفاد کیلئے۔"

کارلائل لکھتا ہے کہ:

"کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کرلو، پھر اُسے اٹھا کر اطاعت کیلئے اعلیٰ ترین مقام پر رکھدو اور اس کی عزت کرو، اس طرح تم اس ملک کیلئے ایک مکمل حکومت دریافت کرلوگے، پھر بیلٹ بکس ہے، یا پارلیمنٹ میں ہونے والی فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی کوئی اور مشینری اس حکومت میں کوئی بہتر اضافہ نہیں کرسکے گی، یہ ایک مکمل ریاست ہوگی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہوگا"

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ جس "شخصی حکومت" کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہے ہیں، وہ شخصی حکومت کی مذکورہ بالا خرابیوں سے خالی ہے۔ وہ اس معنیٰ میں بے شک "شخصی حکومت" ہے کہ اس میں جمہوری انداز کی پارلیمنٹ مختار کل نہیں ہے اور اختیاراتِ حکومت بڑی حد تک "خلیفہ" یا "امیر المومنین" کی ذات میں مرکوز ہیں، لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس "خلیفہ" یا "امیر المومنین" کا تعین وراثت یا قوت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اہل حل وعقد کے انتخاب کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس انتخاب کے لئے "خلیفہ" میں کچھ معیاری اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے جن کے بغیر اہل حل وعقد کیلئے کسی شخص کا انتخاب جائز نہیں۔ ان اوصاف میں علمی قابلیت کے علاوہ کردار کی اعلیٰ ترین پختگی اور رائے کی اصابت بھی داخل ہے آجکل کی جمہوریتوں میں سربراہ کے انتخاب کیلئے عموماً نہ کوئی قابلیت شرط ہوتی ہے، نہ کردار وعمل کی کوئی خوبی لیکن "خلیفہ" کے لئے اسلام میں

نہایت کڑی شرائط تجویز فرمائی گئی ہیں۔ اور اہلِ حلّ وعقد کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان شرائط کا مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد خلیفہ کا انتخاب کریں۔

پھر یہ خلیفہ بھی، جو اعلےٰ ترین علمی اور عملی اوصاف کا حامل ہے مطلق العنان قانون ساز نہیں ہوتا، بلکہ قرآن وسنت اور اجماع امت کا پابند ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قانون وضع نہیں کرتی، بلکہ ایک ایسے آسمانی قانون کی بنیاد پر وجود میں آتی اور اسی کو نافذ کرتی ہے جو کائنات کی اعلےٰ ترین اتھارٹی کا بنایا ہوا ہے اور قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ ہاں قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے انتظامی قوانین اور احکام جاری کرنا حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے اہلِ شوریٰ سے مشورہ لے۔ اس مشورے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر کثرتِ رائے کی پابندی کرے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجائیں اور ان کو مدنظر رکھنے کے بعد وہ اپنی بہترین قابلیت اور اللہ تعالےٰ کے بھروسہ پر خود فیصلہ کرے۔

اس کے علاوہ سربراہِ حکومت کا ہر اقدام، اس کا ہر حکم اور اس کا بنایا ہوا ہر قانون چونکہ قرآن وسنت کے تابع ہوتا ہے لہٰذا اگر کسی وقت یہ سربراہ قرآن وسنت کے احکام سے تجاوز کرے یا عدل وانصاف کے خلاف کوئی کام کرے تو قاضی کی عدالت سے اس کے خلاف چارۂ کار حاصل کرنا ہر ادنیٰ

شہری کا ناقابل تنسیخ حق ہوتا ہے۔

اس نظام حکومت کی تمام تفصیلات کو بیان کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن یہاں بتلانا صرف یہ تھا کہ حکیم الامت قدس سرہٗ نے اسلام میں جس "شخصی حکومت" کا تذکرہ فرمایا ہے اس میں قدیم بادشاہتوں اور جدید فاشی حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی خرابی کے بنیادی اسباب موجود نہیں ہیں۔

اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی متفقہ دستاویز درج کی جاتی ہے، جسمیں فیصلہ صدر کی رائے پر ہونیکی بالکل صاف تصریح ہے۔

❖

فیصلہ کثرت رائے سے نہ ہوگا بلکہ حق فیصلہ صدر مجلس کو ہوگا

اکابر جمعیۃ علماء ہند کی متفقہ دستاویز

۱۰، ۱۱، دسمبر ۱۹۲۱ء کو بدایوں میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند۔ مولانا سبحان اللہ صاحب، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا محمد ثاخر صاحب مولانا عبد الماجد صاحب مولانا محمد سجاد صاحب حکیم حافظ محمد اجمل خانصاحب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب۔ سید ظہور صاحب سکریٹری مسلم لیگ مولانا غلام محمد صاحب شملوی، مولانا مختار احمد صاحب صدیقی، مولانا نذیر احمد صاحب خجندی، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا عبد الودود صاحب مولانا انوار الحق صاحب، مولانا فرخندہ علی صاحب نے امیر الہند کے فرائض و اختیارات کا جو مسودہ پیش کیا تھا اس میں دفعہ ۱۴ میں لکھا ہے۔

اختیارات

دفعہ ۱۴ مجلس دار الخواص و دار العوام کے اندر مسائل شرعیہ کا فیصلہ کثرتِ رائے سے نہ ہوگا بلکہ دلائل کے بعد قوتِ دلیل یا ترجیح دلیل کی بنا پر فیصلہ ہوگا وہی قول فیصل ہوگا۔ اور حقِ فیصلہ صدرِ مجلس کو ہوگا۔

(بحوالہ ہندوستان میں امارت شرعیہ کا نظام اور جمعیۃ علماءِ ہند کی جد و جہد ص ۱۶ ص ۲۶)

خلاصۂ کلام

(۱) نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کی ان تمام تصریحات کو پڑھنے کے بعد ناظرین کرام خود فیصلہ فرمالیں کہ ان سے جمہوریت یعنی شوریٰ کی بالادستی ثابت ہورہی ہے یا شخصیت یعنی امیر کی بالادستی ثابت ہورہی ہے۔

(۲) یقیناً ہر خالی الذہن شخص جو اپنے اکابر کی ان تحریرات کو پڑھے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے گا کہ ان تمام تحریرات سے شوریٰ کی بالادستی کے بجائے امیر یا مہتمم کی بالادستی ثابت ہورہی ہے۔

(۳) درحقیقت مشورہ کی اہمیت اس کی ضرورت اور اس کے فوائد و فضائل سے انکار نہیں سب اپنی جگہ تسلیم ہیں، اصل سوال تو یہ ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کس کی رائے پر ہو امیر کی یا شوریٰ کی؟ ہمارے اکابر کی تحریرات سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کا مدار مہتمم یا امیر کی رائے پر ہے، شوریٰ کی رائے پر نہیں ہے۔ چونکہ شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں ہے

جیساکہ : قرآن وحدیث کے مختلف قسم کے دلائل سیرتِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے تعامل اور اپنے اکابر دیوبند کے طرزِ عمل سے مدلل طور پر ثابت کیا گیا ہے۔

(۴) جمہوری طرز میں چونکہ شوریٰ ہیئت حاکمہ ہوتی ہے اس لئے شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کے بعد کسی بھی صدر یا امیر کو اپنی صوابدید پر کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا کثرتِ آراء کیساتھ مجلس شوریٰ جو فیصلہ کردے ہر حال میں اس کی پابندی امیر پر لازم ہوتی ہے خواہ وہ اس کی نظر میں صواب ہو خواہ غیر صواب۔ بخلاف اس کے اسلام کی جامع تعلیمات میں ایسا نہیں ہے، یہاں اہلِ شوریٰ کے مشورہ کے بعد فیصلہ ایک فرد واحد کی رائے پر ہے، مشورہ میں مختلف آراء کے آنے کے بعد امیر جیسا مناسب اور بہتر خیال کرے فیصلہ کردے۔

بسا اوقات فیصلہ کے وقت ایسا ہوتا ہے کہ امیر سب کی رایوں کے خلاف محض اپنی رائے پر فیصلہ کرتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ مشورہ میں سے اقلیت کی رائے کو بہتر اور مناسب سمجھ کر اس پر فیصلہ کردیتا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہلِ مشورہ میں سے اکثریت کی جو رائے ہو وہ امیر کو پسند آجاتی ہے اور اُسے بہتر اور مناسب خیال کرکے اختیار کرلیتا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کردیتا ہے۔ اسی تیسری صورت میں جہاں اکثریت کی رائے کے مطابق

فیصلہ ہوتا ہے بعض حضرات کو اشتباہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ یہاں اکثریت کی رائے پر فیصلہ ہوا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ کثرت آراء پر فیصلہ کرنا ہی شرعی اصول ہے۔ حالانکہ ان کا یہ سمجھنا صحیح نہیں چونکہ یہاں فیصلہ کن اہل مشورہ کی کثرت آراء نہیں ہے، بلکہ خود امیر کا اکثریت کی رائے کو پسند کرنا اور اس کے مطابق عزم کرکے فیصلہ صادر کرنا ہے۔

یہ اشتباہ بھی بحمدہ تعالیٰ اسلاف و اکابر کی تحریرات سے بخوبی دور ہوگیا چونکہ جہاں جہاں بھی اکثریت کی رائے کو پسند کرکے اسپر فیصلہ کیا گیا ہے وہاں اس کی پوری طرح وضاحت آچکی ہے کہ یہاں اکثریت کی رائے کے بعد فیصلہ امیر کی رائے پر ہوا ہے۔

(۵) اپنے اکابر کی ان تحریرات سے یہ امر بھی بخوبی واضح ہوگیا کہ رسالہ اہتمام وشوریٰ میں قرآن وحدیث کے دلائل سے جو کچھ لکھا ہے وہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ اور تمام اکابر واسلاف کی تصریحات کے خلاف نہیں بلکہ حرف بحرف مطابق ہے۔

(۶) انشاء اللہ العزیز صاحب فہم سلیم کے لئے اتنا کافی ہے اسکے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش ازروئے انصاف باقی نہیں رہتی اور اگر کوئی شخص مروجہ جمہوریت کو بطور اصول شرعیہ کے پیش کرے تو ان تحریرات کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی انصاف پسند خالی الذہن شخص اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔